مقالات خطیب اعظمؒ

حصہ چہارم

مصنف

مولانا سید غلام عسکری طاب ثراہ

نام کتاب : مقالات خطیب اعظمؒ

مصنف : مولانا سید غلام عسکری طاب ثراہ

کمپوزنگ : شاہد رضا اعظمی، 9696681176

سنہ طباعت :

تعداد :

قیمت :

ناشر :

مقالات خطیب اعظمؒ

حصہ چہارم

میرے استاد نہ تھے مگر......

مدرسۃ الواعظین کی تین سالہ تعلیمی زندگی میں ایک صاحب جب اسلام قبول کرنے آئے۔ استاد مرحوم جناب علامہ عدیل اختر صاحب قبلہ اعلیٰ اللہ مقامہ اس وقت سربراہ تعلیم تھے۔ قبولیت اسلام کے مراحل سے فارغ ہونے کے بعد ہم طلاب ان صاحب کے گرد تفتیش احوال کے لیے جمع ہوگئے۔ میں نے ان سے سوال کیا کہ وہ کون سی بات تھی جس نے سب سے پہلے آپ کو آبائی مذہب ترک کرنے اور اسلام قبول کرنے پر آمادہ کیا۔ انہوں نے بیان کیا کہ ہم جن کو خدا کا اوتار مانتے تھے جب ہم نے ان کے حالات میں یہ پڑھا کہ انہوں نے پھول توڑتے ہوئے اس عورت کو دیکھا جو بعد میں ان کی بیوی بنی اور دیکھتے ہی دل میں محبت پیدا ہوگئی۔ تو میرے دل میں کھٹک پیدا ہوئی کہ جو ابھی بیوی نہیں ہے وہ نامحرم ہے۔ اسی کو نہیں دیکھنا چاہیے۔ اگر نظر پڑ جائے تو نگاہ ہٹا لینا چاہیے۔ یہ ہمارا کردار ہونا چاہیے۔ تو پھر جو خدا کا نمائندہ اور اوتار ہے اس کا کردار تو بہت بلند ہونا چاہیے۔ یہی وہ پہلا تاثر تھا۔ جس نے مجھے از سر نو مذہب کے بارے میں غور کرنے پر متوجہ کیا۔ اور غور کا سلسلہ آج اس منزل پر پہنچا جو آپ کے سامنے ہے میں نے پھر سوال کیا کہ آپ نے اپنی تاریخ کے اس واقعہ کو بہت مرتبہ پڑھا ہوگا۔ پہلے کیوں نہیں متوجہ ہوئے۔ بعد میں کیوں متوجہ ہوگئے۔

میرے سوال پر انہوں نے وضاحت کی کہ میری نشست و برخواست ایک شیعہ

جج کے پاس رہتی تھی۔ میں بھی کچہری میں نوکر ہوں۔ جج صاحب اپنے معصوم اماموں اور نبیوں کے واقعات بیان کیا کرتے تھے۔ ان معصوم کرداروں کو سنتے سنتے میری یہ حس بیدار ہوگئی کہ خدا کے نمائندہ سے کوئی غلط کام نہیں ہوسکتا۔ اس حس کے بیدار ہونے کے بعد جب اسی واقعہ کو پڑھا اور سنا جسے بار بار پڑھا اور سنا تھا تو وہ نیا تاثر پیدا ہوا جو تبدیلی مذہب پر آ کر ختم ہوا۔

آج اس واقعہ کو گزرے کم از کم ۳۱ سال ضرور ہو چکے ہیں۔ کیونکہ میرا زمانہ تعلیم ۱۹۴۸ء سے ۱۹۵۱ء تک تھا اور آج ۱۹۸۳ء ہے لہٰذا آپ مجھ سے یہ سوال کر سکتے ہیں کہ تم کو آج یہ واقعہ کیوں یاد آیا جو ہم کو سنا رہے ہو۔ تو عرض ہے کہ مدرسۃ الواعظین کا ۳ سالہ تعلیم زمانہ ہی وہ عہد ہے جس نے مجھ کو سب کچھ دیا۔ اور مجھے سب کچھ دینے والے میرے استاد مرحوم تھے۔ علامہ عدیل اختر سے پہلے مجھے کم از کم دو درجن اساتذہ کے سامنے زانوئے ادب تہہ کرنے کا موقع ملا۔ اور میں اپنے مقدر پر نازاں ہوں کہ میرا ہر استاد مجھ سے ہمیشہ خوش رہا۔ جو چند اساتذہ زندہ ہیں خدا ان کو سلامت رکھے وہ آج بھی میرے لیے دعا گو ہیں اور ان کی دعائیں ہی میری کشتی حیات کا بادبان ہیں۔ لیکن بغیر کسی مبالغہ کے مجھے اقرار ہے کہ علامہ عدیل اختر سے پہلے مجھے ایک کے بعد دوسرا بہتر استاد ملتا گیا۔ لیکن آپ کے بعد پھر کوئی آپ سے بہتر درکنار آپ کا جیسا بھی نہ مل سکا۔

استاد مرحوم کی تعلیم و تربیت نے ذہن ایسے سانچہ میں ڈھال دیا جس کے بعد بڑی بڑی شخصیتیں انتہائی قربت حاصل ہونے کے باوجود مجھے متاثر نہ کر سکیں۔ جب کوئی میرے سامنے آتا تو میں اس کا موازنہ استاد مرحوم کے ہشاش بشاش تقویٰ سے کرتا۔ تو یا مجھے خشک تقویٰ ملتا یا پلاسٹک کا تقویٰ دکھائی دیتا جس میں رنگ تو ہوتا مگر نہ زندگی ہوگی نہ

نمو ہوتا۔ بلکہ صرف فریب نظر ہوتا۔ اور مجھے شدید مایوسی ہوتی اور جب کسی علمی ذہن کا مقابلہ استادمرحوم کے دین ودانش سے کرتا تو کہیں مجھے دیمک خوردہ بوسیدہ کتاب دکھائی دیتی۔ کہیں بجھی شمع نظر آتی۔ کہیں صرف لباس کا فانوس نظر آتا۔ جس کا رنگ شاید اسی لیے سیاہ ہوتا کہ اس کے اندر کا خلا نظر کی گرفت میں نہ آئے۔ کہیں بے مہار فکر نظر آتی جو دین کے حدود کو پھلانگ جاتی۔ اور کہیں بے ترشے علمی پتھر ملتے جن کو اپنے بے ڈھنگے ہونے کا احساس بھی نہ ہوتا۔ کوئی صرف مسکرانے کو سوال کا جواب قرار دیتا۔ کوئی سوال کو توہین علمی قرار دیتا۔ لیکن اس دور میں بھی چند ایسی شخصیتیں ملیں جو میرے کٹھور ذہن کو بھی متاثر کرتی رہیں۔

استادمرحوم کے ساتھی مولانا سید محمد عمید صاحب قبلہ مرحوم اعلی اللہ مقامہ جب تک زندہ رہے ان کی خدمت میں حاضر ہونا اور مسلسل سوال کرتے رہنا میری زندگی کے خوشگوارترین لمحات ہوتے تھے اور کبھی مولانا مرحوم نے کسی سوال کے جواب میں نہ سکوت اختیار فرمایا نہ مجھے غیر مطمئن حالت میں چھوڑا کیونکہ غیر مطمئن ہونے پر تو میں خود ہی پوچھنا چھوڑ دیا کرتا تھا۔ لیکن مولانا محمد عمید صاحب قبلہ کے پاس سے جب بھی اٹھا تو یا سوالات کی فہرست تمام ہو چکی ہوتی تھی یا وقت ختم ہو چکا ہوتا تھا۔

دوسری شخصیت جس کے کردار نے مجھے متاثر کیا وہ جناب مولانا سید محمد حسین صاحب قبلہ اعلی اللہ مقامہ تھے۔ آج بھی خدا سلامت رکھے ان کے بڑے بھائی جناب مولانا سید محمد حسن صاحب قبلہ کربلائے معلیٰ میں تشریف رکھتے ہیں۔ لیکن مجھے مولانا حسن صاحب قبلہ سے قریب ہونے کا موقع نہ مل سکا۔ البتہ مولانا حسین صاحب قبلہ سے قریب رہا۔ لیکن میری قربت ذہنی اور روحانی اور کرداری تھی۔ روزانہ حاضری کی نہ تھی۔

آپ کی عمر نے وفا نہ کی۔ جلد ہم سے جدا ہو گئے۔ اور میرا ذہن سہارے کی تلاش میں سرگرداں نہ ہو سکا۔ کیونکہ مجھے سرکار ظفر الملۃ مل چکے تھے۔ ظفر الملۃ کو جتنا میں قریب سے دیکھتا گیا اتنا ہی قریب ہوتا گیا۔ یہاں تک کہ کچھ لوگ مجھ سے اسی لئے دور ہوتے گئے کہ میں کیوں لکھنؤ سے دور دراز مقام پر قیام کرنے والے ایک غیر مشہور خاندان میں پیدا ہونے والے اور ایک غیر معروف قریہ میں بسنے والے شخص سے اتنا قریب ہوں۔ مگر ان حضرات کی دوری میری لیے مزید راحت کا سبب بنتی گئی۔

کیونکہ میری فکر کی ان کی فکر سے بنتی نہ تھی۔ سکون یک خیالی میں ہے یک عملی میں ہے۔ دو عملی بھی تباہ کن ہوتی ہے اور دوفکری بھی صرف پریشان خیالی میں اضافہ کرتی ہے۔ میں ظفر الملۃ سے قریب تھا۔ مگر اظہار خیال کی پوری آزادی کے ساتھ۔ اختلاف رائے کی بھرپور گنجائش کے ساتھ۔ کیونکہ یہی آزادی اور یہی گنجائش اس اتحاد رائے تک پہنچاتی ہے جس میں اختلاف رائے کی گنجائش باقی نہیں رہ جاتی ہے۔ اور نہ عمل میں رائے کے خلاف کوئی آزادی باقی بچتی ہے۔ سفر میں ساتھ رہا۔ تنہائیوں میں ساتھ رہا۔ صعوبات میں ساتھ رہا۔ قومی تلاطم میں ساتھ رہا۔ صحت و مرض میں ساتھ رہا۔ مگر ظفر الملۃ کی زندگی میں، شخصیت کی پرچھائی تک نہ دیکھی۔ ہمہ وقت دین و دیندار کے لیے متفکر دیکھا اور پریشان حال افراد اور پریشان کن مسائل کے حل کے لیے پریشان دیکھا، منہیات کو دیکھتے ہی پر جلال ہو جاتے تھے اور معروف کے سامنے آتے ہی پر جمال ہو جاتے تھے۔

یہ دونوں متضاد کیفیتیں بیک وقت پیدا ہوتی تھیں۔ دونوں کا پیدا ہونا ان کی عادت تھی۔ اور دونوں الگ الگ رکھنا ان کی مہارت سے معلوم ہوتا تھا کہ موج کے پیچھے

موج آرہی ہے۔ ہر موج الگ الگ تھی مگر دریا ایک تھا۔ آج ان کی وفات پر شاید محسوس
ہوتا ہے کہ اب میں اکیلا ہوگیا ہوں۔ لیکن جس قدر بھی خدا کا شکر ادا کروں کم ہے کہ
ظفر الملۃ کی زندگی ہی میں مجھے ایک ایسی شخصیت مل گئی جس کا علم وعمل میرے لیے ہر
طرح باعث اطمینان ہے بس میری دعا ہے کہ خداوند عالم علامہ سید ذیشان حیدر صاحب
جوادی کو طول عمر دے۔ باصحت رکھے۔ اور ان کی توفیقات میں اضافہ فرماتا رہے۔ سچ
ہے خدا کی رحمت کبھی ختم نہیں ہوسکتی۔ کبھی اس کی رحمت سے مایوس نہیں ہونا چاہئے۔ خدا
کا شکر ہے کہ استاد مرحوم اعلیٰ اللہ مقامہ کے انتقال کے بعد بھی اس نے مجھے کبھی مایوس
نہیں ہونے دیا۔ کبھی اکیلا نہیں چھوڑا۔ بلکہ ہمیشہ کسی نہ کسی علمی وکرداری شخصیت کو مجھ تک
یا مجھ کو ان تک پہنچا دیا۔

مسلمان بننا ہے تو
فکری انقلاب لائے

ان کالموں میں یہ بات مسلسل لکھی گئی ہے کہ انسانی زندگی کی فلاح وبہبود
کے لیے لازم ہے۔ ضروری ہے کہ انفرادی اور اجتماعی طور پر دینی واقفیت اور دینی
پابندی کی مہم چلائی جائے۔ اس مہم کی عظیم الشان کامیابی کا عصری ثبوت اسلامی
انقلاب ہے۔ جس نے اسلام پر جمی ہوئی صدیوں کی شاہی وطاغوتی گرد کو جھاڑ کر
اسلام کے نورانی چہرہ کو پوری آب وتاب کے ساتھ دنیا کے سامنے پیش کر دیا ہے۔
کیونکر فحاشی مٹ سکتی ہے۔ کیونکر بے پردگی وعریانی فنا ہوسکتی ہے۔ کیونکر لوٹ کھسوٹ
اور استحصال کا خاتمہ ہوسکتا ہے۔ کس طرح ملک میں جان ومال وعزت کا تحفظ ہوسکتا
ہے۔ کس طرح مسجدوں کے ساتھ دل بھی آباد ہوسکتے ہیں۔ کس طرح دماغ کتب
خانوں میں تبدیل ہوسکتے ہیں۔ کس طرح زبان اور خیالات میں ایمانی آہنگی ہوسکتی
ہے اور قلب وزبان کا نفاق دور ہوسکتا ہے۔ کسی طرح شخصیت سے تکبر کو دیس نکالا دیا
جاسکتا ہے اور تواضع وانکساری وبردباری وحلیمی ورحم دلی ومواسات ومساوات کو خون
کے ساتھ رگ وپے میں دوڑایا جاسکتا ہے۔ کس طرح مسجد میں مقید اسلام کو بازار،
کھیت، سڑک، میدان جنگ، فیکٹری میں پہنچایا جاسکتا ہے۔ کس طرح یونیورسٹی کو بے

دین افراد کی پیداوار کی جگہ کے بجائے پابند دین دانشوروں کی پیداوار کی جگہ بنایا جاسکتا ہے۔ جہالت جہاں مٹائی جارہی ہو اور کردار ڈھالے جارہے ہوں۔ غرضکہ بے دین زمانہ کو کس طرح چودہ سو سال پیچھے ڈھکیل کر نبوی وعلوی عہد کو دنیا کے سامنے لانے کی کامیاب کوشش کی جاسکتی ہے یہ اسلامی انقلاب کی کامیابی کا مختصر سا تعارف ہے۔ اسلام کے نورانی چہرہ کی تابنا کی دیکھ کر سپر پاورس کی آنکھیں چندھیا گئی ہیں۔ وہ جاہلیت عرب کے نقش قدم پر چل کر اس چراغ کو بجھانا جانتے ہیں جس کے نہ بجھنے کا الٰہی وعدہ قرآن مجید میں موجود ہے۔

کل ابولہب وابوجہل قسم کے لوگ اسلام کے مقابلہ پر آئے تھے آج صدام اور صدام حامی چھوٹی بڑی حکومتیں صدام کے ذریعہ اس چراغ کو بجھانے کی کوشش میں مکمل بے حیائی کے ساتھ لگی ہیں۔ بے شرمی کی حد ہوگئی کہ اقوام متحدہ کے کمیشن نے تصدیق کر دی کہ عراق نے عالمی منشور کی خلاف ورزی کی۔ انسانی حقوق کی پائمالی کی۔ ممنوعہ کیمیاوی بم استعمال کئے۔ لیکن بے چارہ اقوام متحدہ عراق کی مذمت بھی نہ کرسکا کیونکہ اس عہد کے بے حیاء اعظم امریکہ نے غیر انسانی، ظالمانہ، جابرانہ حق تنسیخ، ویٹو پاور استعمال کرلیا۔ اور ساری مہذب دنیا بہ لب ہوگئی۔ جانبداری کی بن آئی۔ غیر جانبداری کو موت آگئی۔ حالات کچھ بھی ہوں، مادی طور پر جو کچھ بھی ہوجائے لیکن اسلامی انقلاب لاکھوں رکاوٹوں کے باوجود انسانی فکر کو متاثر کر رہا ہے اور متاثر کرتا رہے گا۔

ہم کو اس راز کی تلاش کی ضرورت ہے جس کے ذریعہ اسلامی انقلاب آیا ہے تاکہ ہم بھی اپنی زندگی کو اسلامی بنا سکیں۔ اپنے خاندان کو اسلامی بنا سکیں۔ اپنی ملت کو

اسلامی بنا سکیں اور ہماری زندگیاں معصومین علیہم السلام کی خواہش کے مطابق خاموش اسلامی مبلغ بن جائیں۔ یہ کام نہ دولت کے طمطراق سے ممکن ہے، نہ مسلمان حکومتوں کی کوڑے بازی سے ممکن ہے۔ نہ تھوڑی سی اخلاقی نمائش سے ممکن ہے۔ جبکہ دولت کے ساتھ دولت کی مکروہ برائیاں بھی ساتھ ہیں۔ جبکہ اسلامی حکومتوں میں خود اسلام کے لیے کوئی جائے پناہ اور گوشہ عافیت نہیں ہے جبکہ تھوڑی سی اخلاقی نمائش کے ساتھ بد اخلاقیوں کا مجموعہ سماج میں موجود ہے۔ ہاں یہ ممکن ہے تو فکری پاکیزگی، فکری انقلاب، فکری اصلاح کے ذریعہ۔ افراد کو دیندار بنانا ناممکن ہے جب تک فکر دیندار نہ ہوجائے۔ حضور مرسل اعظمؐ نے اسی لیے جاہلیت عرب کی اصلاح کی پہلی منزل میں سب سے فکری اصلاح کی دعوت دی تھی کہ لا الہ الا اللہ کہو تا کہ بھلائی پاؤ۔ ہماری لغزش کوتاہی خامی یہی ہے کہ ہم کو فکری اصلاح کی فکر نہیں ہے۔

قوم خاندانوں سے بنتی ہے۔ خاندان افراد سے بنتے ہیں۔ افراد خیالات سے بنتے ہیں۔ فکر کی اصلاح کی ابتدا ہوتی ہے خدا پر ایمان لانے سے اور انتہا ہوتی ہے آخرت کے یقین پر۔ اللہ پر ایمان اور آخرت کے یقین تک پہنچانے کے لیے فکری اصلاح کی ضرورت ہے۔ اسی فکری اصلاح کے لیے ایک لاکھ چوبیس ہزار نبی بارہ امامؑ تشریف لائے جو عمل میں تو بے خطا اور معصوم تھے ہی ان کی فکر بھی بے خطا تھی۔ بے نسیان تھی، بھول چوک، خطا وغلطی کو نہ ان کی فکر میں جگہ مل سکتی تھی نہ ان کی زندگی میں۔ یہ حضرات اپنے ساتھ جہاں اپنا شیریں پیغام لائے وہیں پتھروں کو موم کر دینے والی پاکیزہ زندگی لائے۔ اور پتھروں سے چشمے پیدا کر دینے والی قولی وفعلی قوت تبلیغ بھی لائے۔ جن لوگوں نے ان حضرات سے متاثر ہوکر اپنی فکری اصلاح کر لی وہ مومن ہوگئے۔ جنہوں

نے فکری پاکیزگی کی بلندیاں حاصل کرنا شروع کردیں وہ حر بنے، حبیب بنے، زہیر بنے، مالک اشتر بنے، عمار یاسر بنے، مقداد بنے، ابوذر بنے اور ایمان ے سارے درجوں پر فائز سلمان بنے وہ سلمان جو فارسی تھے مگر محمدی بن گئے۔ جن کی فکری اصلاح نہ ہوسکی وہ یا تو کھلم کھلا کافر رہے یا منافق بنے۔

آج دین سے ناواقف اور پابندی دین نہ کرنے والے سماج میں پیدا ہونے والے اور پروان چڑھنے والے یا تو دین پر معترض ہیں۔ یا بے سمجھے دین کو مان رہے ہیں۔ یا حسب ضرورت دین کی حمایت ومخالفت دونوں کام انجام دے لیتے ہیں اور اپنی اس دورخی کو بلند فکری، وسیع النظری اور مسائل کا حل سمجھ رہے ہیں اس کے نتیجہ میں ہم مسلمان ہیں مگر ویسے ہی برے مسلمان ہیں جیسے شاہ کے عہد میں ایران میں مسلمان تھے۔ زندگی کے آئینہ میں صورت دیکھنے کی ضرورت ہے۔ حاجت بیان نہیں ہے۔ اگر ہم اس صورت حال کو برا اور غلط سمجھتے ہیں اور اسے تبدیل کرنا چاہتے ہیں تو ہم کو سب سے پہلے اپنی فکری اصلاح کرنی ہوگی اپنی نظر اور دل کے چور پکڑنا ہوں گے۔ اپنا حساب خود کرنا ہوگا۔

اس مضمون میں اس اصول کا تذکرہ کیا جاتا ہے جس کے ذریعہ ہم فکری اصلاح کرسکتے ہیں اور صالح افراد صالح خاندان صالح ملت پیدا کرسکتے ہیں وہ زریں اصول ہے کہ ہم روزانہ بلکہ ہر لمحہ اپنی نگرانی کریں کہ ہم

گناہ سوچتے ہیں یا نہیں

جب تک ہم گناہ سوچ سکتے ہیں۔ گناہ کرسکتے ہیں۔ گناہ پر خاموش رہ سکتے ہیں، گناہ برداشت کرسکتے ہیں۔ گناہ میں ساتھ دے سکتے ہیں مگر جب گناہ کو اپنی فکر میں

اپنی نظر میں داخل نہ ہونے دینے کی مشق پیدا کرلیں گے اسی دن سے ہم اور گناہ کے درمیان نہ مٹنے والا فاصلہ پیدا ہوجائے گا۔ اور ہم کو اپنے یا غیر کے گناہ کے خلاف عملی فیصلہ کرنے اور گناہ کے خلاف لوہا لینے کے فیصلے میں ایک سکنڈ کی بھی دیر نہ ہوگی۔

لہٰذا ہم کو چاہئے کہ ہم مشق کریں کہ ہماری سوچ میں ہماری فکر میں ہماری نظر میں گناہ کو گھسنے کا موقع نہ مل سکے۔

اگر اسلام مکمل مذہب ہے

تو اسے ہر انسانی مسئلہ کا سامنا کرنا ہوگا مسئلہ چاہے انفرادی ہو یا اجتماعی۔ کیونکہ اگر ایک بھی مسئلہ ایسا ہے جس کے حل سے اسلام گریزاں ہے تو اس مسئلہ میں ہر مسلمان کو غیر مسلم جادہ کا اتباع کرنا ہوگا جس کی اجازت نہ مذہب میں ہے نہ ہوسکتی ہے۔ چنانچہ زندگی میں جو کام بھی ہمیں کرنا ہوگا اس کے لیے مذہب کا کوئی نہ کوئی حکم ضرور موجود ہوگا اور ممکن نہیں ہے کہ وہ کام احکام شریعت کی پانچ قسموں میں سے کسی ایک قسم کے ماتحت نہ ہو یعنی واجب ہوگا یا حرام، مستحب ہوگا یا مکروہ یا مباح۔ فعل مباح کا کرنا بھی اسی لیے جائز ہے کہ مذہب نے اس کی اجازت دی ہے۔ اگر ہمیں کسی مسئلہ میں مذہب کا پیش کردہ حل نہیں معلوم ہے تو ہماری علمی کوتاہی ہے نہ کہ مذہب کی کمی۔

آج انسانی ذہن انفرادی مسائل سے زیادہ اجتماعی مسائل کو سوچتا ہے معمولی قلب و دماغ بھی یہ سوچنے پر مجبور ہیں کہ دوسری ہر قوم کے مقابلہ میں ہماری قوم تنظیم اور اجتماعی اقدامات میں سب سے پیچھے ہے بلکہ دوسرے جب ملنا سیکھ رہے ہیں ہم لڑتے جارہے ہیں وہ آگے بڑھ رہے ہیں تو ہم پیچھے ہٹ رہے ہیں اور کمزور پستی، ناداری، بداخلاقی وغیرہ کے گڑھوں میں گرتے جارہے ہیں۔ موجودہ صورت حال پر جب لوگ یہ سوچ رہے ہیں کہ ہم ترقی کے لیے کیا مفید تدابیر اختیار کریں

مذہب ان حالات میں ہماری کیا رہبری کرتا ہے تو کچھ ایسے بھی ہیں جن کا یہ وہم بڑھ رہا ہے کہ ہمارے مذہب میں کوئی خامی ایسی ہے جس کی وجہ سے تمام اہل مذہب تباہی کی طرف بڑھ رہے ہیں۔ راقم الحروف اس محل پر چند سطریں اسی لیے سپرد قلم کررہا ہے کہ مفکر اور منکر ذہن دیکھیں کہ ہم حل رکھتے ہیں یا حل پر عمل کرنے کے بجائے اس کی مخالفت کررہے ہیں۔

تنظیم دو جزوں کا نام ہے۔ جماعت اور فنڈ مذہب ہر مسلمان سے خواہش مند ہے کہ وہ عادل ہو یعنی کبیرہ گناہوں سے مکمل پرہیز کرتا ہو اور صغیرہ گناہ اگر کبھی اس سے سرزد ہوجائے تو اس شدت سے شرمندہ ہو کہ پھر اس سے وہ گناہ نہ ہو اگر ہمارا معاشرہ اس حد تک پاکیزہ ہوجائے تو پھر جماعت میں افتراق کیونکر پیدا ہو۔ اختلاف کے بعد اور پہلے جو کچھ ہم کہتے ہیں وہ غیبت وایذاء مومن اور اکثر افتراء محض ہوتا ہے اگر ہم سب عادل ہوتے اور حقوق مومن کو نہ صرف جانتے ہوتے بلکہ ادا کرنے والے بھی ہوتے تو تنظیم ہم میں پیدا کرنے کی ضرورت نہ ہوتی بلکہ ہم قہراً خود منظّم ہوتے تنظیم اداء حقوق ومراعات حقوق کا سبب بنتی ہے اور اداء حقوق ومراعات حقوق ہم میں تنظیم کا سبب ہے عادل معاشرہ کا مذہب کس قدر خواہش مند ہے اس کا اندازہ اسی بات سے ہوسکتا ہے کہ ستار العیوب کے مذہب میں غیر عادل کی گواہی قبول نہیں بلکہ اس کو شرمندگی اور رسوائی کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ چونکہ ہم نے صرف چند پیش نمازوں کے لیے ''عدالت'' کو محدود کررکھا ہے اور وہ بھی اس حد تک کہ اس مولوی اور عالم وذاکر کے لیے بھی عدالت ہمارے معیار ہیں کوئی ضروری چیز نہیں رہ گئی ہے جو نماز نہیں پڑھاتا چنانچہ ہم مولوی ہوکر یہ فخر کرتے ہیں کہ نماز نہیں پڑھاتے اور اسے خوبی سمجھتے ہیں حالانکہ ہم اپنے غیر عادل

(یعنی فاسق) ہونے کا اعلان کرتے ہیں اور اس اعلان پر فخر بھی کرتے ہیں اور کیوں نہ کریں جبکہ ہمارے اعلان کا سننے والا مجمع ہماری تعریف کرتا ہے کہ کیا اچھا نفس ہے۔ سوچو عیب ہنر بن گیا ہے یا نہیں۔

چونکہ قوم کی اکثریت غیر عادل ہے (اور ہم سب اس پر راضی ہیں) لہٰذا عادلوں کا محدود طبقہ قوم کو اپنی طرف کھینچنے کے بجائے خود قوم کی طرف کھنچ رہا ہے اگر مومنین واقف دین و پابند ہی ہوتے تو لازمی طور پر طبقہ علما بھی بلندی کردار کی طرف بڑھتا اور قوم کے کردار میں گراوٹ کے بجائے اٹھان ہوتی ہے۔

دوسروں کو جماعت بنانے کی ضرورت ہے ہم اعلم وقت کی قیادت میں ساری دنیا میں خود بخود جماعت بن سکتے ہیں مگر اپنے کو مذہب کے حوالے کرنا ہوگا۔ مذہب کی ملکیت بننا ہوگا اس کے برخلاف ہم مذہب کے مالک بنتے جارہے ہیں۔

دوسرا اہم حصہ ''تنظیم فنڈ'' ہے جو ضرورت مندوں پر صرف ہو اور نظام اجتماعی کو چلائے۔ حکومت یہ کام ٹیکس کے ذریعہ کرتی ہے اور جماعتیں اس کے لیے چندہ کرتی ہیں دونوں صورتوں میں ٹیکس اور چندہ کا معتد بہ حصہ اپنے مصرف پر صرف ہونے سے پہلے ''وصولی کے اخراجات'' پر صرف ہوجاتا ہے، اور دینے والے دونوں صورتوں میں اپنے پر جبر محسوس کرتے ہیں۔ لہٰذا اندھا دھند بن جاتے ہیں اور وصولی کی مشکلات کا دفتر کھل جاتا ہے اور پھر اس پر نگراں اور نگراں پر دفتر کھلتے رہتے ہیں۔ نتیجہ میں وہی مشکل ہاتھ لگتی ہے مشکل کشائی نہیں ہوتی اس کے برخلاف مذہب نے اپنے فنڈ جز عبادت بنا دیئے ہیں جن کا وصول کرنا ضروری نہیں ہے بلکہ خود جس پر واجب ہوں اس پر ان کا ادا کرنا واجب ہے اور دوسرے کے بجائے خود اس کی ذمہ داری ہے کہ یوں ادا کرے کہ صحیح مصرف پر

صرف بھی ہوجائیں ورنہ ادائیگی کے باوجود وہ ذمہ دار رہے گا۔ اللہ کی حکومت کے ٹیکسوں کے نام ہیں خمس حق سادات خمس حق امام علیہ السلام، زکوٰۃ مال، زکوٰۃ جان (فطرہ) کفارہ نذر، خیرات، صدقات۔

اگر پوری قوم اپنے واجب حقوق ادا کرے تو کیا کسی حاجت مند کو سوال کی ضرورت پڑے گی نہیں بلکہ ہم کو مستحق کی تلاش ہوگی۔ اور نہ ہم کو کسی مقصد کے لیے چندے کی ضرورت ہوگی بلکہ ہر صحیح ادارہ کے پاس خود رقم موجود ہوگی۔ میرا اندازہ صرف قیاسی ہے یا واقعات پر مبنی ہے اس کے لیے صرف یہ دیکھنا کافی ہے کہ ہندوستان میں ہمارے ادارے مفلوک الحال قریب بہ مرگ ہیں بلکہ بعض ادارے صرف ''پرانے قلعے'' رہ گئے ہیں جن کو آثار قدیمہ کے سنتری بطور عبرت دکھا رہے ہیں یا گورستان ہیں جن کو مجاور اپنے ظل عاطفت میں لئے ہیں کیونکہ ہم حقوق واجبہ ادا نہیں کرتے بلکہ صرف چندہ دیتے ہیں اور پانچ روپیہ چندہ دے کر فخر بھی کرتے ہیں احسان بھی سمجھتے ہیں حالانکہ ہم پر پچاس روپے خمس یا زکوٰۃ وغیرہ کے واجب ہوتے ہیں جن کو ادا کئے بغیر ہم اللہ کے سامنے سزا بھگتنے کے لیے بے خبری اور خود فریبی کے ہاتھوں جارہے ہیں۔ یقیناً اس ذہنیت نے یہی نقصان پہنچایا ہے کہ چندہ قوم کی ملکیت ہے اس کا حساب سب کو معلوم ہونا چاہئے اور رقوم واجب ''مصافحہ'' میں دیدیئے جائیں ان کا نہ اعلان ہو نہ حساب جس نے یہ ذہنیت بھی پیدا کی کہ تحصیل رقوم شریعہ ذریعہ معاش بن جائے حالانکہ اس کا تعلق از اول تا آخر صرف معاد سے ہے معاش کے لیے اس میں کوئی جگہ نہیں رکھی گئی ہے۔ جبکہ شریعت نے حکم دیا تھا کہ واجب رقوم علی الاعلان دو اور مستحب خیرات (جن میں چندہ بھی آتا ہے) مخفی طور پر دی جائیں۔ شریعت کی ہدایت کو منقلب

کر کے ہم خود اندھے منھ گر رہے ہیں لہٰذا جماعت وانجمن سازی کے فرسودہ کاموں پر بہ انداز کہن صرف وقت وقوت صرف کرنے کے بجائے ہماری ہر جماعت وانجمن بلکہ ہر فرد کو کوشش کرنا چاہیئے کہ ''فرد عادل'' کی پیدوار بڑھائے اور چندوں کی مہم پر حقوق واجبہ کی ادائیگی کی تحریر کو ترجیح دے۔ ویسے بھی قومی بدحالی زیادہ دن تک چندے کی متعدی وبا کو برداشت نہ کر سکے گی۔ اور فنڈ کے مفقود ہونے کے بعد جماعتوں میں زندگی کا بھی کوئی امکان نہیں۔

کہیں ہم ایمان نہ کھو بیٹھیں

ہم بے شک مسلمان ہیں۔ لیکن ہمارے مسلمان ہونے کے معنی یہ ہیں کہ ہم غیر مسلم نہیں ہیں۔ اگر ہم کو معلوم ہو جائے کہ یہ بات اسلام کے خلاف ہے تو ہم اس کے ماننے سے انکار کر دیں گے۔ البتہ اسلام کیا ہے۔ ہم کو اس کے معلوم کرنے کی فکر نہیں ہے بلکہ جو چلن ہمارے سماج میں ہے۔ ہم بھی اس کے ساتھ ہیں یہ معلوم کئے بغیر کہ یہ اسلام کے مطابق ہے یا مخالف ہے۔ ہماری اس ناواقفیت نے ہمارے اسلام کی صورت بدل دی ہے اور ہم کو اس قابل نہیں رکھا ہے کہ ہم خدا و نبی و امامؑ کو اپنی صورت دکھا سکیں۔ ہمارے سماج میں یہ خیال عام ہے کہ خوش حالی اور بدحالی اعمال کا نتیجہ ہے۔ ہم جب کسی نیک سے نیک اور پابند دین آدمی کو دکھی دیکھتے ہیں کہ بیماریوں کا شکار ہے۔ اس کے بچے بچپنے میں مر جاتے ہیں۔ یا بیمار رہتے ہیں۔ بار بار اسے کاروبار میں نقصان ہوتا رہتا ہے۔ یا زمانہ کے ذلیل افراد اس کو طرح طرح کی تکلیفیں دیتے ہیں اور ستاتے ہیں تو اسے دکھی دیکھ کر ہمارا سماج فیصلہ کرتا ہے کہ آدمی شریف ہے۔ نیک ہے۔ پابند دین ہے۔ دوسروں کے کام آتا ہے۔ مگر خدا کے بھید خدا ہی جانے۔ نہ معلوم خدا کو اس کی کون سی بات ایسی بری لگ گئی ہے کہ اس کے دکھ ختم نہیں ہوتے بلکہ کم بھی نہیں ہوتے روز بڑھتے جاتے ہیں۔ حالانکہ خدا کے لیے بھید کا لفظ استعمال کرنا بھی نامناسب ہے۔ کیونکہ آدمی آدمیوں سے خوفزدہ ہو کر اپنے کاموں کو

اور کاموں کے مقاصد کو پوشیدہ رکھتا ہے کچھ کہتا ہے، کچھ چھپاتا ہے، کچھ کرتا ہے۔ جب اس کی مکمل تصویر ہمارے سامنے نہیں ہوتی ہے تب ہم کہتے ہیں کہ اس کے بھید ہم کو نہیں معلوم۔ اس کے برخلاف خدا کو کسی سے کوئی خوف نہیں ہے کہ کچھ چھپائے۔ البتہ اس کے کاموں کی وجہ کا علم حاصل کر لینا ہم کمزور ومحدود عقل والوں کے بس سے باہر ہے لہٰذا ہم کو اس کے کاموں کی وجہ نہیں معلوم ہوسکتی ہے۔ ایسے موقع پر مناسب ہے کہ ہم کہیں کہ خدا بلکہ نبی وامامؑ کے کاموں کی مصلحت کو ہم نہیں جانتے بلکہ نہیں جان سکتے۔ بلکہ وہ خود ہی اپنی مصلحتوں کو جانتے ہیں ہم تو صرف اتنا جانتے ہیں کہ وہ جو کچھ کرتے ہیں وہی بہتر ہے۔ اور مومن کے ساتھ ان کا وہی سلوک ہوتا ہے جو اس کے لیے مفید ومناسب ہوتا ہے۔ ایمان کی مضبوطی یہی عقیدہ ہے چاہے ہم کو یا کسی مومن کو نعمت ملے یا مصیبت ملے۔

غرضکہ ہم نے جب کسی نیک انسان کو پریشان دیکھا تو خدا کو اس سے ناراض مان لیا۔ اس کے برخلاف جب ہم نے کسی جواری، شرابی، عیاش، لوگوں کی نیند حرام کردینے والے۔ خدا کا گناہ اور حکومت کے جرائم کرنے والے کو خوش حال دیکھا تو فیصلہ کرلیا کہ آدمی بہت برا ہے مگر نہ معلوم خدا کو اس کی کون سی بات پسند آ گئی ہے کہ یہ ساری برائیاں کرتا جاتا ہے اور خدا اسے نعمتیں دیئے جاتا ہے۔ بدترین جرائم کرتا مگر پکڑا نہیں جاتا اگر پکڑا بھی جاتا ہے تو ثبوت نہ ملنے کی وجہ سے چھوٹ جاتا ہے۔ سینکڑوں عزتیں اس نے برباد کردی ہیں۔ درجنوں خون اس نے کیئے ہیں مگر اللہ کے بھید اللہ ہی جانے کہ کیوں اس پر مہربان ہے۔

کچھ لال بجھکڑ اللہ کے بھید بتانے بھی لگتے ہیں کہ غریبوں کی دعائیں لیتا ہے۔

خیرات کرتا ہے۔ محلّہ والوں کے کام آتا ہے محلّہ میں کچھ نہیں کرتا ہے وغیرہ وغیرہ۔ اور یہ لال بجھکڑ نیک انسان کے دکھی ہونے کے بھید بھی بتاتے ہیں کہ نیک ضرور ہیں مگر کسی کی آہ لگ گئی ہے۔ حلال وحرام کے چکر میں کماتے ہیں اتنا کم ہیں کہ اپنا خرچ پورا نہیں کرپاتے تو خیرات کیا کریں گے۔ چونکہ سچے ہیں لہٰذا کھری بات بھی کہہ دیتے ہیں کہ لوگوں کے کھیل بگڑ جاتے ہیں۔ ابھی پرسوں ہی کی بات ہے کہ فلاں بیوہ کی غریب لڑکی کی شادی طے ہو رہی تھی۔ ان سے بھی رائے لی گئی۔ یہ اس لڑکے کا حال جانتے تھے کہ شرابی بھی ہے۔ حلال کمائی بھی نہیں۔ چھین جھپٹ سے اس کا کام چلتا ہے۔ کئی شادیاں کرکے چھوڑ چکا ہے۔ باتیں سب سہی تھیں مگر لڑکے نے جو زیور اور کپڑے بھیجے تھے ان کو دیکھ کر ماں لڑکی بیاہنے پر تیار تھی۔ مگر انہوں نے کچا چھٹا کھول دیا۔ ان کی بھی غلطی نہیں ہے۔ جب رائے لی گئی تو جو جانتے تھے وہ بتا دیا مگر جب زیور کپڑے واپس ہو رہے تھے۔ تو بیوہ ماں اپنی یتیم لڑکی سے لپٹ کر ایسی روئی کہ دیکھنے والوں کے دل دل کٹ کٹ گئے۔ اب تم ہی بتاؤ۔ لڑکی بیٹھی ہے۔ ماں کے دل پر پہاڑ بھر بوجھ ہے۔ آہیں ہیں اور آنسو ہیں۔ کیا عجب کہ ان کی پریشانی کا سبب بھی ان کی ایسی نیکی ہو۔ سنا یہی ہے کہ آہوں سے عرش لرز جاتا ہے۔ ہم تو ان کی پریشانی کا سبب ان کی نیکی اور سچائی اور اچھائی کو سمجھتے ہیں۔

ہمارا سماج اس وقت بھی سر ہلاتا ہے اور ہاں میں ہاں ملاتا ہے جب کہا جاتا ہے نہ معلوم کون سی بات ان کی خدا کو بری لگ گئی اور کون سی بات اس کی خدا کو اچھی لگ گئی اور اس وقت بھی بے جھجھک تصدیق کرتا ہے جب لال بجھکڑ عزتیں لوٹنے والے قاتل کی خیرات کو اس کی خوش حالی کا سبب قرار دیتے ہیں اور پابند دین شریف

انسان کی سچائی اور کھری زندگی کو ان کی بدحالی کا سبب قرار دیتے ہیں۔ وجہ صاف ہے۔ سماج ایک تھالی ہے اور ہم اس کی گولی ہیں لہٰذا تھالی جیسے بھی ہلے گی ہم بھی ہلیں گے البتہ اگر ہم نے اسلام سے واقفیت حاصل کی ہوتی اور ہم نے اپنے کو اسلام کے خانہ میں فٹ کیا ہوتا تو ہم تھالی کے بیگن نہ ہوتے۔ بلکہ صحیح و غلط کا فرق جاننے والے ہوتے۔ نسلی اور سماجی مسلمان نہ ہوتے۔ بلکہ اصلی اور اصولی مسلمان ہوتے۔ مگر ہمارے سماج میں تو ہر شخص مسلمان پیدا ہوتا ہے لہٰذا اسلام جاننے کی کیا ضرورت ہے۔ ہمارے پاس وہ عقل خداداد موجود ہے کہ جب بھی کبھی زندگی میں اسلام کی کوئی بات معلوم کرنا ہوگی تو ہم اپنی عقل سے معلوم کرلیں گے۔ ہاں اسلام کے علاوہ ہر بات سے ہم جاہل ہیں لہٰذا ہم کو ہر بات کی تعلیم حاصل کرنا ضروری ہے ورنہ ہمارا مستقبل خراب ہوجائے گا۔ حالانکہ جہالت کو علم سمجھنا اور سماج کو اسلام سمجھنا اور جس دین کو بتلانے، سمجھانے کے لیے ایک لاکھ چوبیس ہزار نبیؑ اور بارہ امامؑ آئے ہیں۔ اس کے جاننے کے لیے اپنی کمزور اور خطا کرنے والی عقل کو کافی سمجھنا مذہب کا سب سے بڑا المیہ ہے اور ہمارا سب سے بڑا افلاس ہے۔ مگر ہم مسلمان ہیں کچھ جانے بغیر کہ اسلام کیا ہے اور کیا نہیں ہے۔ ہماری یہ مستی ایک دن ضرور رنگ لائے گی مگر وہ دن حساب کا دن ہوگا جس کا مالک خدا ہے۔

آپ نے سماج کی الٹی پلٹی رام کہانی تو سن لی۔ اب ذرا سنئے اسلام کیا کہتا ہے تا کہ معلوم ہوجائے کہ سماجی پیمانے اور اسلامی پیمانے ایک دوسرے سے کتنے الگ ہیں۔ اگر اچھوں کی تکلیف کی وجہ خدا کی ناراضگی ہے تو پھر انبیاء کیوں تکلیف میں رہے۔ جناب ایوبؑ کیوں سخت بیمار ہوئے۔ جناب ابراہیمؑ کیوں بڑھاپے تک اولاد سے محروم

رہے۔ جناب موسیٰؑ کیوں جلا وطن ہوئے۔ حضور کو کون سی اذیت ہے جو نہیں پہنچی۔ جناب معصومہ نے وہ مصیبتیں کیوں برداشت کیں جو دنوں کو سیاہ رات بنا دیتیں۔ مولیٰ نے وہ دکھ کیوں جھیلے کہ نافرمانوں سے فرمایا تم نے میرے کلیجہ کو پیپ سے بھر دیا ہے۔ امام حسنؑ نے خون جگر پی پی کر کیوں زندگی بسر کی اور واقعہ کربلا میں مصائب اپنی انتہا کو کیوں پہنچے۔ ان حضرات کی تکلیف بھری زندگی کا سبب یہ تھا کہ خدا ان کے مدارج کو بلند کرنا چاہتا تھا اور ان کے کردار کے کمال کی جھلکیاں انسانوں کو دکھلانا چاہتا تھا تا کہ ہمارا یقین مستحکم ہو کہ خدا نے جن کو اپنا کوئی عہدہ نبوت یا امامت یا عصمت دیا ہے تو ان کے بلند ترین کمال کی بنا پر دیا ہے۔ معصوموں کے بعد جو غیر معصوم نیک اور صالح لوگ مصیبتوں میں رہے ہیں ان کے الگ الگ حالات کی بنا پر الگ وجہیں ہوسکتی ہیں۔ جناب عباسؑ و جناب زینبؑ جیسے افراد کی مصیبتیں ان کے درجات کی بلندی کے لیے تھیں۔ البتہ کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جن کی بیماری دکھ تکلیف کی وجہ یہ ہے کہ دنیا ہی میں ان کے گناہوں کا کفارہ ہوجائے۔ آخرت میں صرف ثواب رہ جائے۔ عذاب دنیا میں ختم ہوجائے اور ہم میں سے وہ مومن بے حد خوش نصیب ہے جس کے دنیا کے مصائب آخرت کے عذاب سے بچانے کا ذریعہ بن جائیں۔ گناہوں کے کفارہ اور بلندی درجات کے علاوہ نیک انسانوں کی تکلیفوں کا ایک سبب یہ بھی ممکن ہے کہ دکھ ایسے خدا سے قریب کرتے ہوں۔ دنیا کی محبت اور غرور کو اس کے دل سے نکالتے ہوں۔ وہ بھی بہترین خوش نصیب انسان ہے جس کے دکھ اس کی ہدایت کا سامان فراہم کریں۔ لہٰذا ہرگز اچھے انسان کی تکلیف کو خدا کی ناراضگی کا سبب قرار نہیں دینا چاہئے۔ بلکہ مصیبتیں راحت ہیں چاہے سامان ہدایت ہوں چاہے گناہوں کا کفارہ ہوں۔ چاہے علم

ومعرفت میں اضافہ کا ذریعہ ہوں۔ چاہے دوسروں کی ہدایت کا سامان ہوں۔ چاہے آخرت کے درجات کی بلندی کا سبب ہوں۔

رہے برے انسان تو ان کی خوش حالی خدا کی پسندیدگی کا ثبوت ہرگز نہیں ہوسکتی۔ جتنی بڑی غلطی اور جتنا بڑا جرم وگناہ ہے نیک انسان کی تکلیف کو خدا کی ناخوشی قرار دینا اتنا ہی بڑا جرم اور عدل خدا کے خلاف عقیدہ رکھتا ہے۔ برے انسان کی خوش حالی کو خدا کی خوشی قرار دینا۔ اگر یہ بات درست ہے تو کیا ایک سکنڈ کے لیے بھی خدا۔ یزید سے، نمرود سے، فرعون سے، ابن ملجم سے، متوکل سے راضی تھا۔ نہیں ہرگز نہیں۔ ان ظالموں کے پاس جو خوشحالی تھی وہ خوشحالی نہ تھی بلکہ سامان عذاب تھا۔ واقعہ کربلا سے پہلے یزید مرجاتا تو اس کو وہ دردناک عذاب نہ ہوتا جو آج ہو رہا ہے۔ واقعہ کربلا کے بعد مرجاتا تو اسیران کربلا پر مظالم کی جو سخت ترین سزا پا رہا ہے اس سے بچ جاتا۔ اگر مدینہ اور مکہ کی بے حرمتی سے پہلے مرجاتا تو اس کا عذاب پھر بھی کم رہ جاتا۔ لہٰذا اس کو عمر نہیں ملی تھی حکومت نہیں ملی تھی طاقت نہیں ملی تھی بلکہ خدائے قہار اس کے لیے سخت عذاب کا انتظام کر رہا تھا۔ بروں کی خوش حالی کا سبب خدا کی ناراضگی اور ناخوشی ہے۔ لہٰذا ہم حالات کے بارے میں جب بھی سوچیں تو صرف اسلامی پیمانوں کے مطابق سوچیں ورنہ اپنا ایمان بھی کھو بیٹھیں گے۔ دینی تعلیم ہی کے ذریعہ اسلامی اور سماجی پیمانوں کا فرق معلوم ہوسکتا ہے۔

اگر آپ کو خود مطالعہ کا موقع نہیں ملتا ہے تو تنظیم المکاتب کے مراسلاتی کورس کا فارم بھر کر مراسلاتی کورس میں شامل ہوجائے۔ ڈاک سے سوالات جائیں گے آپ ڈاک سے جواب بھیجیں گے۔ اس طرح مذہبی مطالعہ، مذہبی مباحثہ کا موقع مل جائے گا۔

آپ اپنے مشاغل میں بھی مصروف رہیں گے اور دینی تعلیم بھی حاصل کرلیں۔ آپ خود بھی سوالات کرسکتے ہیں۔ جن کے جوابات ہم حاضر کریں گے۔

بہرحال دینی واقفیت ضروری ہے ورنہ سماج کی جہالت ہم کو لے ڈوبے گی۔

مل جل کر دینی، ذہنی انقلاب لائیں

جماعت کے تمام آدمی جمع تھے۔ ہر ادارہ کا نمائندہ بھی موجود تھا۔ اعلیٰ تعلیم یافتہ افراد بھی شریک بحث تھے۔ عوام بھی نتیجہ کے انتظار میں شریک جلسہ تھے۔ زیر بحث بات یہ تھی کہ چاند ۲۹ کا ہے یا ۳۰ کا۔ عاشورہ ہفتہ کو ہوگا یا اتوار کو۔ محکمہ موسمیات نے مبہم بیان دیا تھا کہ چاند نکلنے کا امکان ہے مگر چاند نکلنے کی تصدیق نہیں کی تھی۔ سن رسیدہ، بااثر، دولت مند قوم کے بزرگ ۲۹/کا چاند ماننے پر تیار نہ تھے۔ ۲۹/کا چاند مان لینے میں ان کو بعض انتظامی دشواریاں تھیں۔ عاشورہ کے دن جو سامان درکار تھا اس کی فراہمی ہفتہ کے دن ممکن نہ تھی۔ بااثر بزرگوں کے زیر اثر ذاکر اور علماء بھی گول گول باتیں کر رہے تھے۔

تین دن تین جگہ جلسے ہوئے بحثیں تلخیوں تک پہنچ گئیں مگر قوم کو فیصلہ معلوم نہ ہو سکا۔ کیونکہ حقائق شخصیتوں کے نیچے دبے تھے اور افراد، ادارے، صاحبان محراب و منبر بھی شخصیتوں سے ٹکر لینا خلاف مصلحت سمجھتے تھے۔ تین دن کی بحث نے یہ بات واضح کر دی تھی کہ ۲۹/کو چاند نکل آیا تھا۔ عادل لوگوں کی گواہیاں فراہم ہو چکی تھیں۔ چاند تو ۲۹/کو نکل آیا تھا۔ مگر فیصلہ ۳۰/درکنار ۳۳ کو بھی نہیں نکلا تھا۔ لوگ پریشان تھے۔ دو عاشورہ کا ہونا قومی اتحاد کے خلاف ہے۔ اعمال کس دن کئے جائیں۔ فاقہ کے دن کھایا جائے رونے کے دن خاموشی رہے۔ اسی طرح کی بہت سی پریشانیاں تھیں جو قومی ذہن پر چھائی ہوئی تھیں۔ مجمع میں شور بڑھ رہا تھا۔ عورتوں میں بے چینی بڑھ رہی تھی۔ مگر اقوام متحدہ بھی

مسئلہ کے حل کے لیے بیکار تھی کہ ایک نوجوان اٹھا اور اس نے ایک مولوی صاحب سے سوال کیا۔

بتائیے شریعت کے مطابق عاشورہ ہفتہ کو ہے یا اتوار کو۔ مولوی صاحب نے کہا شریعت کے مطابق تو عاشورہ صرف ہفتہ کو ہے۔

اس سوال اور جواب کے بعد مجمع میں شور بلند ہوا ہم کو صرف شریعت پر عمل کرنا ہے۔ اور بس۔ بحثیں ختم ہوگئیں۔ اختلافات مٹ گئے۔ بے چینی بے نشان ہوگئی۔ شخصیتیں اپنا سانھ لے کر رہ گئیں۔ کیونکہ قوم میں ذہنی انقلاب آ گیا تھا اور یہ انقلاب اسلام کے ذریعہ آیا تھا۔

خاندان بھر پریشان تھا۔ تین مہینہ سے شادی کی تاریخ طے ہو رہی تھی مگر طے نہیں ہو پاتی تھی۔ شادی طے ہے۔ لڑکا مختصر رخصت پر امریکا سے آنے والا ہے۔ جہیز تیار ہے۔ ولیمہ کا سامان اس حد تک تیار ہے کہ بس پکنے کی دیر ہے مگر دماغ پک گئے ہیں اور تاریخ طے نہیں ہوئی۔ دولہا پی۔ ایچ۔ ڈی ہیں۔ امریکا میں ریسرچ کر رہے ہیں اور لکچرر بھی ہیں۔ رائٹر ہیں اور رائلٹی کے ذریعہ خوش حال ہیں۔ سب کچھ پڑھے ہیں مگر دین سے ناواقف ہیں۔ اماں، نانی اماں، خالہ اماں، دادی جان نے جو کچھ بتایا ہے اسی کو دین سمجھ رہے ہیں۔ اور اپنی اس ناسمجھی کو کمال معرفت سمجھتے ہیں کہ دین کے معاملہ میں سر تسلیم خم کئے ہوئے ہیں۔

دلہن والے بھی خاندانی آئی سی ایس ہیں۔ اس فیملی میں ۳/نسلوں سے اعلیٰ افسران ہوتے آئے ہیں۔ بڑی فیملی ہے۔ تعلیم یافتہ ہے اور بہت مذہبی ہے۔ کبھی خراب تاریخ میں سفر نہیں کرتے۔ چلتے وقت جو ماش کی دال اور آٹا صدقے میں نکالا جاتا ہے وہ

فوراً خاندانی فقیر کو بھیج دیا جاتا ہے۔ جو خاندانی جواری بھی ہے۔ خیر خیرات میں کبھی کمی نہیں کرتے۔ نماز عید اور عاشورہ کے دن ضرور پڑھتے ہیں، روزہ ۲۱/رمضان کو اور فاقہ دس محرم کو ضرور رکھتے ہیں۔ خمس، زکوٰۃ سے ناواقف ہیں۔ مگر اپنے مذہبی ہونے پر بھرپور یقین رکھتے ہیں۔

شادی کی تاریخ اس لیے طے نہیں ہوتی کہ بارات کے آنے اور جانے کے دن اگر اچھے پڑتے ہیں تو تاریخیں خراب ہیں۔ اگر تاریخیں اچھی نکلتی ہیں تو دن خراب ہوجاتے ہیں۔ دادی اماں کہتی ہیں میری بارات خراب دن آئی تھی میں ۱۵/دن میں رانڈ ہوگئی وہ تو کہیئے مرحوم کی نشانی میری لاعلمی میں میری کوکھ میں رہ گئی تھی جو آج اس خاندان کے چراغ روشن ہیں۔ لہٰذا میرے پوتے کی بارات خراب دن نہیں جاسکتی ہے۔

لڑکی کی والدہ کہتی ہیں میری خالہ جان شادی کے چھ مہینہ کے اندر بیوہ ہوگئی تھیں۔ اس کے بعد سے ہمارے خاندان میں خراب دن تاریخ شادی نہیں ہوتی۔ دن تاریخ کے چکر میں طے شدہ رشتے، دس دس سال تک جھولتے رہے۔ جوانیاں ڈھل گئیں تب شادیاں ہوئیں مگر خراب دن تاریخ شادیاں نہیں ہوئیں۔ میری لڑکی بھی چاہے بیس سال بیٹھی رہے مگر خراب دن تاریخ شادی نہ ہوگی۔ شادی کرنا ہے، موت کے منھ میں تھوڑے جانا ہے۔ دونوں خاندان علمی اور مذہبی تھے مگر شادی کو خراب دن اور تاریخیں روکے ہوئے تھیں۔ تحفۃ العوام، جنتریاں، کلنڈر، مولوی، استخارے، مشورے، سب کے ڈھیر لگ چکے تھے۔ امریکا سے ہندوستان تک پریشانی پھیلی ہوئی تھی مگر مسئلہ ناقابل حل تھا۔ کیونکہ موت خراب دن اور تاریخ میں چھپی ہوئی تھی۔ سب مشورہ دیتے تھے۔ بڑا خاندان ہے اگر کچھ ہوگیا تو ساری خرابی ہمارے سر جائے گی۔ مصلحت نے علماء کے

ہونٹ سی دیئے تھے تو دوسرا کون تھا جو بولتا۔

محلّہ میں شب جمعہ ایک مختصر سی مجلس تھی جس میں ایک نوجوان مولوی صاحب نے مجلس پڑھی۔ مختصر مجلس کے خیال سے سب ہی لوگ شریک ہوگئے۔ مولوی صاحب نے مجلس میں قرآن مجید کی ان آیتوں کا تذکرہ کیا جن میں موت کے دن کے معین ہونے کا ذکر ہے۔ کہ اس دن سے پہلے موت نہیں آسکتی اور اس دن واپس جا نہیں سکتی۔ موت خدا اور صرف خدا بھیجتا ہے۔ اس مختصر مجلس نے اتنے بڑے مسئلہ کو حل کر دیا۔ شادی کی تاریخ طے ہوگئی کیونکہ موت اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ دن تاریخ کے ہاتھ میں موت نہیں ہے۔ خراب دن تاریخ بھی خدا نے بنائے ہیں اور ان کا علاج صدقہ بتایا ہے۔ وہ صدقہ جو نذرانہ پروردگار سمجھ کر نکالا جائے۔ مالک کے حضور میں پیش کیا جائے۔ حقیر نہ سمجھا جائے پابند دین مومن تک خاموشی سے پہنچایا جائے۔ دادی اماں اور خالہ جان کے اندیشے ختم ہوگئے۔ کہ جب خدا کا فرمان ہے تو پھر بسم اللہ کرو۔ اب کس بات کا ڈر ہے۔

ذہنی انقلاب جو اسلام کی قیادت میں آیا اس نے ہندوستان سے امریکہ تک کی پریشانی ختم کر دی۔

مقدمہ چلتے ہوئے تیسری پشت تھی۔ جائداد مقدمہ کے خرچ میں تحلیل ہوچکی تھی۔ صرف بینک میں جو رقم جمع تھی اس کے ملنے کی امید میں تیسری نسل سپریم کورٹ میں کھڑی تھی۔ مقدمہ کی بنیاد یہ تھی کہ رئیس کی دو بیویاں تھیں۔ ایک سے ایک لڑکا تھا اور دوسری سے تین لڑکے تھے۔ پہلی بیوی والے رواج کے مطابق آدھا حصہ مانگتے تھے اور دوسری بیوی والے شریعت کے مطابق چوتھائی حصہ دینا چاہتے تھے۔ چاروں لڑکوں کی اولادوں سے اب پورا ایک محلّہ آباد تھا۔ مگر مقدمہ کی تلوار نے خاندان اور محلّہ کو دو حصوں

میں بانٹ رکھا تھا۔ پہلی بیوی کی اولاد میں ایک شخص تو توضیح المسائل خرید لایا اس میں میراث کے مسائل لکھے تھے۔ اس نے اپنے پورے خاندان کو کتاب پڑھوائی۔ مقدمہ سپریم کورٹ سے واپس ہوگیا۔ صلحنامہ داخل ہوگیا۔ رقم تقسیم ہوگئی اور تقسیم شدہ دل مل گئے۔ توضیح المسائل میں یہ مسئلہ بھی ملا کہ مومنین کے لیے غیر شرعی عدالت میں فیصلہ کے لیے جانا بھی حرام ہے۔ اس ذہنی انقلاب نے ماضی کو دھودیا۔ حال کو سنوار دیا اور مستقبل کو تاریکی سے بچالیا۔

ہمارے انفرادی، خاندانی، گھریلو، قومی مسائل کا حل صرف یہ ہے کہ قوم میں دین کے مطابق ذہنی انقلاب آئے۔ جس کے لیے دینی تعلیم اور دینی پابندی کی ضرورت ہے۔ آیئے مل جل کر دینی ذہنی انقلاب لائیں۔

غصہ سے ساؤدھان

مکان کی حفاظت کے نام پر خطرناک سے خطرناک کتے پالے جاتے ہیں جو رات کیا دن مین بھی کمپاؤنڈ میں کسی کو قدم نہیں رکھنے دیتے۔ کبھی کبھی آنے والے ناواقفیت میں بری طرح ان کا شکار بن جاتے ہیں اور ایک قدم کی غلطی مہینوں چلنے پھرنے سے معذور کر دیتی ہے۔ لہٰذا قانونی بچت کے لیے بعض کوٹھیوں میں ایک بورڈ لگا رہتا ہے ''کتے سے ساؤدھان'' کتے سے خبردار رہیئے۔ اس کے بعد کتا کسی کو نوچ ڈالے تو مالک کے خلاف قانونی چارہ جوئی نہیں ہوسکتی۔ اس طرح مالک کا مسئلہ تو حل ہوگیا لیکن آنے والے کیا کریں۔ ان کی مشکل کا حل صرف یہ ہے کہ کتا ان کو نوچ نہ سکے۔ اس کی بھی دو شکلیں ہیں ایک یہ کہ کتا ہی نہ رہے۔ دوسری یہ کہ کتا رہے مگر بندھا رہے۔ اور صرف اس وقت کھولا جائے جب کسی کا نوچا جانا ضروری ہو۔ پہلی صورت اس لیے نامناسب ہے کہ مکان کی حفاظت کے لیے کتے کی ضرورت ہے اس لیے کتے کی خرید وفروخت کو شریعت نے حرام قرار دینے کے باوجود مکان، کھیتی، گلہ کی حفاظت کے لیے اور شکار کے لیے کتے کا خریدنا اور بیچنا دونوں جائز قرار دیا ہے۔

البتہ دوسری صورت بالکل مناسب ہے کہ کتا رات کو کھولا جائے جب آنے والوں کے لیے دروازے بند کئے جاچکے ہوں۔ اس کے بعد اگر کوئی ناگہانی طور پر آجائے تو دروازہ کے باہر گھنٹی لگی ہوتا کہ وہ اپنے آنے کی اطلاع دے سکے اور صاحب

خانہ اس کو کتے سے بچا سکے۔اس انتظام کے بعد اگر کوئی شخص چوری چھپے کوٹھی میں گھسے گا
تو اس کی نیت یقیناً خراب ہوگی اور مجرمانہ نیت سے آنے والا اس بات کا حقدار ہے کہ کتا
اس کو پوری طرح بھنبھوڑے نوچ ڈالے زخمی کردے بلکہ اگر آنجہانی کردے تب بھی کوئی
حرج نہیں ہے کیونکہ آنے والے کے مقاصد چوری، قتل، اغوا، بدکاری، وغیرہ ہی ہوسکتے
ہیں اور ایسے حرام مقاصد کا کتے سے علاج، علاج بالمثل کے اصول پر صحیح علاج ہے۔

انسانوں میں عقل، غصہ، خواہش تینوں باتیں پائی جاتی ہیں۔ان میں سے ہر
ایک کی ضرورت ہے مگر ایک کی مقدار اور محل استعمال کی حدیں معین ہیں۔اگر مقدار کم یا
زیادہ ہوجائے یا کل استعمال غلط ہوجائے تو ان میں سے ہر چیز مضر ہوجائے گا۔

عقل کی طرح غصہ اور خواہش کی بھی ضرورت ہے۔اگر غصہ از سرتا پا عیب ہوتا
تو خداوند عالم اس کو پیدا ہی نہ کرتا۔جس طرح مکان، کھیتی، گلہ کی حفاظت کے لیے کتا
ضروری ہوجاتا ہے اسی طرح دین کی حفاظت کے لیے، عزت وناموس کی حفاظت کے
لیے غصہ بھی ضروری ہوجاتا ہے۔ان ہی جائز مقاصد کے لیے اللہ نے کتے اور غصہ کو پیدا
کیا ہے لہٰذا ان ہی جائز مقاصد کے لیے ان کا استعمال ہونا چاہئے۔اگر غصہ ختم ہوجائے
تو غیرت ختم ہوجاتی ہے، عزت نفس کا احساس مٹ جاتا ہے۔یہی بے غیرتی جو طوائف
کے خاندان کو اس مکروہ عمل پر راضی رکھتی ہے اور ماں بہن بیٹی سے پیشہ کراتی ہے اور پیشہ
کی ترقی کے لیے کوشاں رکھتی ہے اس بے غیرتی نے آج کل تہذیب ترقی کے نام پر
سرمایہ دار و سرمایہ پرست حکمراں وخوشامد پسند اور خوشامد خور طبقات میں مزاج طوائف
پیدا کردیا ہے۔ملازمت کی ترقی کے لیے، تجارتی سودے کے لیے، سیاسی عہدوں کے
حصول کے لیے آج کے بے حیا بیوی، بیٹی، بہن کو بھی ذریعہ بنانے میں شرم محسوس نہیں

کرتے۔جس طرح غیر نامزد مجرم، غیر نامزد پاگل بدنام مجرم اور مشہور پاگل سے زیادہ
خطرناک ہوتے ہیں اسی طرح نامزد طوائفوں سے یہ غیر نامزد طوائفوں کے خاندان،
عفت، شرافت، آدمیت، دین، اخلاق، کردار کے لیے زیادہ خطرناک اور مضر ہیں۔

عزت نفس کا جب خاتمہ ہوجاتا ہے انسان احساس کمتری کا شکار ہوجاتا ہے حق
کے مٹ جانے پر راضی رہتا ہے۔اپنے اور والدین اور بزرگوں اور خاندان کے خلاف
اپنے ملک وقوم ودین ومذہب کے خلاف توہین آمیز باتوں پر راضی ہوجاتا ہے۔ایسا
انسان اپنے اپنے خاندان، اپنے ملک، اپنی قوم، اپنے دین کی حفاظت میں ناکام رہتا
ہے۔ایسے ناکارہ افراد کی نہ دنیا میں عزت ہے نہ آخرت میں۔دنیا میں یہ دوسروں کی
خواہشات کا ایندھن بنتے ہیں اور آخرت میں دوزخ کا ایندھن بنیں گے۔ذلت کی اسی
زندگی سے امام حسین علیہ السلام کو انکار تھا۔اور اسی انکار پر ان کے تمام ساتھی مرمٹے تھے
لیکن عزت نفس اور غیرت دین کو برباد نہیں ہونے دیا تھا۔

آج بھی واقعہ کربلا عالم انسانیت کو درس عزت نفس غیرت دین دے رہا ہے۔

مختصر یہ کہ انسانی زندگی میں غصہ کی ضرورت ہے مگر جس طرح عیاری، چالاکی،
مکاری عقل کا استعمال بے جا ہیں۔اسی طرح غیر شرعی غصے غصہ کا بے محل استعمال ہیں۔
مکان کی حفاظت کے لیے کتا ضروری ہے مگر بندھا رہے تاکہ صرف مجرم پر حملہ آور ہو اسی
طرح غصہ بھی قابو میں رہنا چاہئے۔کتے کے گلے میں زنجیر ڈالی جاتی ہے۔غصہ کے گلے
میں ضبط کی زنجیر ڈالی جاتی ہے۔بے جا غصہ انسان کے متکبر ہونے کی نشاندہی کرتا ہے۔
بے جا غصہ آدمی کو ظالم بناتا ہے۔ایذا پسندی کا مزاج پیدا کرتا ہے۔حق تلفیوں پر فکر کراتا
ہے۔بزرگوں کی شان میں دین کے بارے میں گستاخ، جری، اور بدتمیز بناتا ہے۔لوگ

اس سے خوف زدہ رہتے ہیں اور وہ اس خوف کو اپنا اثر سمجھتا ہے لیکن خوف جمع ہوتے ہوتے ایک دن انتقام بن جاتا ہے۔ اس دن غصہ ور ہر شخص کے غصہ کا شکار ہوتا ہے۔ اور اس کی ذلیل زندگی ذلیل موت پر ختم ہوجاتی ہے لہٰذا ہمارا فریضہ ہے کہ ہم اپنے زندگی گھر پر غصہ سے ساؤدھان کا بورڈ اس طرح لٹکائے ہیں کہ بار بار ہماری نظر اسی بورڈ پر پڑتی ہے اور ہم غصہ ضبط کرنے کے عادی ہوجائین غصہ ضبط کرنے میں سب سے موثر خیال ہوتا ہے کہ آج ہمارے غصہ کا دن ہے کہ ہم پر غصہ کا دن ہوگا، آج ہم غصہ کریں گے تو کل ہم کو اس بے جا غصہ کی جواب دہی بھی کرنا ہوگی اور اس غصہ کو چکانا بھی ہوگا جبکہ چکانے کے لیے ہمارے پاس کچھ نہ ہوگا۔

طیش اور عیش دونوں میں غصہ زیادہ آتا ہے اور اس سے بچنے کا ایک ہی طریقہ ہے کہ یاد خدا فراموش نہ ہونے پائے۔ عورتوں کو بیماروں، بوڑھوں کو کمزوروں کو، بچوں کو غصہ زیادہ آتا ہے جو اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ غصہ مردانگی نہیں ہے زنانہ پن ہے۔ غصہ بیماری ہے غصہ کردار کا زوال ہے غصہ کمزوری ہے، خوبی نہیں ہے۔ غصہ انسانیت کی نادانی ہے عقلمندی نہیں ہے۔

یہ تو صنف اس غصے کے تھے کچھ غصوں کا تعلق پیشوں کے لیے ہوتا ہے پولیس اور فوج سے تعلق رکھنے والے غصہ میں اپنی خودی محسوس کرتے ہیں اس لیے غصہ میں بے خود رہتے ہیں۔ مالک کو نوکر پر غصہ آتا ہے اور نوکر مالک کی املاک پر غصہ کرتا ہے۔ بعض مسافر غصہ کے ٹکٹ پر سفر کرتے ہیں اور اس پر یقین رکھتے ہیں کہ غصہ سفر میں مفید رہے گا۔ لیکن اکثر سیانا کوا..... بعض قلی، رکشہ والے، کنڈکٹر بھی غصہ کو مفید سمجھتے ہیں لیکن اکثر خون جلاتے ہیں اور فائدہ اٹھاتے ہیں۔ عہد حاضر میں میاں بیوی کے غصہ بھی پیشہ ورانہ

غصہ میں شامل ہوچکے ہیں جس طرح مہمان ہونا بھی ایک ذریعہ معاش بن چکا ہے میاں یا بیوی میں جس کا غصہ بھی غالب ہوجائے وہ اپنے خواہشات منوانے اور دوسرے کے حقوق تلف کرانے پر قادر ہوجاتا ہے۔ آج کل کمرشل شادیوں میں غصہ بھی ایک پیشہ ہے۔ بمبئی میں دوڈرائیوروں کے درمیان جب غصہ آمیز مکالمے ہوتے ہیں تو جو زیادہ زور سے اور زیادہ بڑی گالی دیتا ہے وہ کامیاب اور دوسرا ناکامیاب ہوجاتا ہے۔ کامیاب بولتا رہتا ہے اور ناکام جلدی جلدی سڑک خالی کرتا ہے۔ یہی بھیا مزاج آج کل گھروں مین رائج ہوگیا ہے۔

پیشہ ورانہ غصوں میں وہ غصے بھی ہیں جو بعض علماء مومنین پر کرتے ہیں اور بعض انجمنوں کے سکریٹری ذاکروں پر کرتے ہیں اور انجمنیں انجمنوں پر کرتی ہیں۔

بعض غصے مکارانہ ہوتے ہیں جیسے ملازم گاہک کے سامنے وہ کھانا لگادے جو باسی ہے اور گاہک اس کے باسی ہونے پر متوجہ ہوجائے تو مالک ملازم پر مکارانہ غصہ کرتا ہے۔ تم اندھے ہو۔ صبح کہہ دیا تھا کہ یہ کھانا کسی کومت دینا، ایسے غصے تاجر، وعدہ خلاف، قرضدار، دھوکہ بازنیتا، مہمان بھگانے والے میزبان وغیرہ اکثر اپنے نوکروں پر عزیزوں پر کیا کرتے ہیں۔

ان غصوں کے علاوہ کچھ غصے موسمی ہوتے ہیں مثلاً گرمی میں قلی، مزدور، رکشتہ والوں کا غصہ سیزنل ہوتا ہے لگن میں، عید اور دیوالی کے قریب دوکان داروں کا غصہ، پھلوں، ترکاریوں کے موسم میں آڑھتیوں کا غصہ بھی موسمی آتا ہے۔ موسمی غصہ دین میں بھی آجاتا ہے۔

ایام عزا میں بانیان مجالس کی منتظمین جلوس کو، حدیث خوانوں کو، صاحبان

بیاض کو، ماتمی انجمنوں کے سکریٹریوں کو اور تبرک تقسیم کرنے والوں کو بھی موسمی غصہ آتا ہے۔ ایام عزا کے علاوہ دینداری کا دوسرا موسمی غصہ ماہ صیام میں آتا ہے۔ جن کو کبھی غصہ نہیں آتا ان کو بھی رمضان میں آتا ہے جن کو دن بھر نہیں آتا ان کو وقت افطار آتا ہے حتیٰ کہ بعض نمازیوں کو طولانی نماز پڑھانے والے پیش نمازوں پر زیادہ غصہ نماز مغرب میں آتا ہے۔ اسی غصہ سے بچنے کے لیے شریعت کی ہدایت ہے کہ پیش نماز مختصر ترین نماز پڑھائے۔ مگر برا ہو شیطان کا وہ نماز ہی میں پیش نماز کو طولانی نماز کی دعوت دیتا ہے وہ روزہ دار کے حسنات کو غصہ کی آگ میں بھسم کرا دیتا ہے غصہ آدمی کو اسی طرح بے عقل بنا دیتا ہے جس طرح شراب زوال عقل کا سبب بنتی ہے۔ غصہ اور نشہ میں انسان ماں سے بیوی کے لہجہ میں بات کر بیٹھتا ہے اور کلمات کفر بک جاتا ہے لہٰذا بھائیوں، غصہ سے ساؤدھان، ضبط غیظ میں اپنے اور دوسروں کے لیے راحت ہے۔ ضبط غیظ شان مومن ہے غصہ نے گھر بگاڑے ہیں، ملک جلائے ہیں قتل عام کرائے ہیں، شرافت، آدمیت اور دین کو خاکستر بنایا ہے لہٰذا آؤ غصہ کو خاکستر بنا کر دین شرافت کا سونا بنائیں اور اس سونے سے جنت خریدیں۔

ہماری ذمہ داریاں

حضور سب کی آنکھوں کا تارا تھے۔ سب آپ سے محبت کرتے تھے۔ جو دیکھتا تھا وہ دیکھتا ہی رہ جاتا تھا اور فریفتہ ہو جاتا تھا۔ جس کا ثبوت واقعہ نصب حجر اسود ہے۔ خانہ کعبہ کی نئی تعمیر ہوئی تھی۔ سب نے مل کر تعمیر میں حصہ لیا تھا۔ تعمیر کی تکمیل کے بعد جب حجر اسود کو اس کی جگہ رکھنے کا وقت آیا تو خواہ مخواہ کا جھگڑا اٹھ کھڑا ہوا کہ حجر اسود کو نصب کرنے کا شرف کس کو حاصل ہو۔ ہر قبیلہ اس شرف کا متمنی تھا جبکہ شرف صرف ایک ہی کو مل سکتا تھا۔ لہٰذا خون پسینہ ایک کر کے تعمیر خانہ خدا میں دوش بدوش کام کرنے والوں کے درمیان پہلے تیوریاں چڑھیں۔ پھر آستین الٹیں اور آخر میں تلواریں کھنچ گئیں۔ اور تعمیر خانہ خدا کے نام پر خون بہائے جانے کا سنگین خطرہ پیدا ہو گیا۔

انسانی زندگی اس المیہ کا اکثر شکار ہوئی ہے کہ کسی مہم میں پُر جوش حصہ لینے والے، مہم کی تکمیل سے قبل باہمی انتشار اور شدید منافرت کا شکار ہو گئے اور تعمیر نامکمل رہی مگر تخریب پایہ تکمیل کو پہنچ گئی۔ بنابریں افراد، اداروں، جماعتوں اور خاندانوں کو اس انسانی تاریخی المیہ سے ہمیشہ چوکنا رہنا چاہئے۔ کیونکہ شیطان کا کام ہے برادران ایمانی کے درمیان نفرت واختلافات کے بیج بونا۔ پھر تقریر وتحریر کے ذریعہ اس کی آبیاری کرانا اور خیر کو دفنا کر شر کے پرچم کو بلند کرانا۔ ہم کو ماضی سے سبق اور عبرت حاصل کرنا چاہئے اور اصلاح حال کے ذریعہ مستقبل کی حفاظت کرنا چاہئے۔

ہم پھر سلسلہ تحریر کی طرف واپس آتے ہیں کہ جب حرم خدا کے نام پر خون کی ندی بہنے کو تھی تو کسی نے تجویز پیش کی آج اس کام کو ملتوی کریں اور کل صبح جمع ہوں۔ جو شخص سب سے پہلے ہماری طرف آئے۔ اس کو حکم بنا کر اس کے فیصلہ کو مان لیں۔ خدا کا رحم شامل حال ہوا۔ شیطان چکر نا کام ہوا۔ لوگ اپنے اپنے گھروں کو بخیریت واپس ہوگئے۔ صبح کو جمع ہوئے۔ طلوع آفتاب کے ساتھ حضور پرنور بھی تشریف لاتے ہوئے دکھائی دیئے۔ خوشی اور اطمینان کی لہر دوڑ گئی۔ ہر شخص اس بات کا اظہار کرنے لگا کہ آپ سے بہتر ثالث تو مل ہی نہیں سکتا تھا۔ غرضکہ حضور نے ایک چادر منگائی۔ اس میں حجر اسود کو رکھا اور ہر قبیلہ کے ایک ایک آدمی کو بلایا اور سب سے کہا مل کر چادر اٹھاؤ تا کہ شرف میں سارے قبیلے شریک ہو جائیں۔ لوگ فیصلہ کو سن کر فرط مسرت سے جھوم اٹھے۔ جب حجر اسود اپنی بلندی تک پہنچا تو حضور نے چادر سے اٹھا کر حجر اسود کو اس کی جگہ پر رکھ دیا۔ اگر حضور کو تمام قبائل کی محبوبیت حاصل نہ ہوتی تو چادر سے اٹھا کر رکھنے میں کوئی بھی معترض ہوسکتا تھا کہ یہ شرف بنو ہاشم کو مل جائے گا۔ مگر سب راضی رہے کیونکہ حضور سب کو اپنا سمجھتے تھے اور سب حضور کو اپنا سمجھتے تھے۔ صدیق وامین کا لقب حاصل کرنے والا یہ محبوب ترین انسان اس وقت شدید نفرت وعداوت کا ہدف بن گیا۔ جب اس نے تبلیغ شروع کی۔ اسلام کو پیش کیا۔ انسانوں کو زندگی کے کرب سے اور آخرت کے دوزخ سے نکالنا چاہا۔ دنیاوی زندگی کا سکون اور آخرت کی جنت تک پہنچانا چاہا تو چاہنے والے دشمن ہوگئے۔ حضورؐ کے خلاف الزام تراشیاں شروع ہوئیں۔ جھوٹی افواہیں پھیلائی گئیں۔ گروپ بندیاں ہوئیں۔ کوئی ایسی زحمت نہ تھی جس میں حضور مبتلا نہ کئے گئے ہوں۔ کوئی مصیبت نہ اٹھا رکھی گئی جو حضور پر نہ ڈھائی گئیں ہو۔ مولائے کائنات حضرت علی علیہ

السلام نے حضور کی ہر موقع پر مدد کی نصرت کی۔ اسلام کی حمایت کی۔ حفاظت کی، اور آپ کی ذریت نے اپنی نسلیں اسی حمایت ونصرت میں بسر کردیں۔ جس کے نتیجہ میں اہلبیت علیہم السلام ایسی غیر معمولی عداوت کے حقدار سمجھے گئے اور ان پر ایسے مصائب کے پہاڑ توڑے گئے کہ تاریخ میں اس کی نظیر نہیں ملتی۔ نہ ان کے ایسے مظلوم ملتے ہیں نہ ان کے دشمن جیسے ظالم دکھائی دیتے ہیں۔ نبیؐ واہلبیتؑ کی غیر معمولی مظلومیت کا واحد سبب تبلیغ تھی۔ آج بھی اگر آپ تبلیغ کے لیے اٹھیں گے تو آپ کے اپنے بیگانے ہو جائیں گے۔ آپ مخالفت، نفرت، عداوت کے ہدف بن جائیں گے۔ آپ کے خلاف الزام تراشیوں، بہتانوں اور جھوٹی افواہوں کا طوفان اٹھ کھڑا ہوگا۔

کل بھی حضور کے خلاف جو مہم چلی تھی اس کی بنیاد قدامت پرستی تھی اسلام کے مخالف یہی کہتے تھے کہ جو باپ دادا سے ہوتا آیا ہے وہی ہوگا۔ ہم اپنے بزرگوں کو غلط مان لیں یہ ممکن نہیں ہے۔ ہاں خدا کا رسولؐ غلط ہے۔ (معاذ اللہ) آج بھی ہر تبلیغ کے خلاف جاہ پرست، خاندان پرست، کھوکھلے کردار والے، عالم نما جہلا، لڑاکو اور حکومت کرو کی پالیسی پر عمل پیرا، دین کے نام پر دنیا کمانے والے، بداعمالی کی حمایت اور جہالت کی مدد یہ کہہ کر کریں گے کہ شریعت غلط ہے۔ احکام دین غلط ہیں۔ علماء وفقہا غلط ہیں جوان باتوں کو غلط کہہ رہے ہیں جو ہمارے بزرگ کرتے آئے ہیں۔ کسی بھی خوشی یا غم کی تقریب کے موقع پر مہمل رسموں اور خلاف شریعت امور کے خلاف تبلیغ کر کے آپ اس کا تجربہ کر سکتے ہیں۔ لیکن کیا امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا حکم دینے والا خدا ہم کو معاف کردے گا اگر ہم نے ڈر کر خاموشی اختیار کر لی۔ نماز، روزہ، واجبات اور احکام دین کے خلاف تحریر وتقریر پر اگر ہم کاموش رہے تو کیا ہم خدا اور رسولؐ وامامؑ کے اس شدید غضب کو

برداشت کرسکیں گے جس کی حقدار ہماری یہ مجرمانہ خاموشی ہوگی۔نہیں اور ہرگز نہیں۔

تو پھر ہر دشمنی، ہر مخالفت، ہر جھوٹ، ہر الزام، ہر بہتان اور تمام افواہوں کا مردانہ وار مقابلہ کرتے ہوئے ہم کو دین کی تعلیم کو عام کرنا چاہیے۔ہم کو خود پابند دین ہونا چاہیے تاکہ معصوم کے ارشاد کے مطابق ہماری زندگی خود ایک خاموش مبلغ بن جائے اور معاشرہ کو دین سے واقف کرانے کے لیے تن، من، دھن سے لگ جانا چاہیے۔اس دنیا کی ہر چیز فانی ہے۔اگر یہ فانی دنیا اور اس کی چیزیں باقی دین کی تبلیغ میں صرف ہوکر ختم ہوجائیں تو اس سے بڑی خوش نصیبی اور کیا ہوسکتی ہے۔

دیکھا یہی گیا ہے کہ سن رسیدہ اور خواص کھلی آنکھوں سے برائیاں دیکھتے ہیں اور مصلحت کے پرستار ہونے کے ناطے خاموش رہتے ہیں لیکن نوجوان اور عوام مومنین حق کے لیے اٹھ کھڑے ہوتے ہیں آج بھی یہی دیکھنے میں آرہا ہے کہ خواص دین کی بے حرمتی پر مہر بہ لب ہیں اور ان کو خدا اور رسولؐ و امامؑ کی ناراضگی کی فکر نہیں ہے۔فکر ہے تو صرف یہ کہ اپنے معاصر افراد ناراض نہ ہوں۔لہٰذا حق اور مذہب کا آخری سہارا عوام اور مومنین ہیں۔جن کو صاحب علم وتقویٰ افراد کی حمایت کے لیے اٹھ کھڑا ہونا چاہیے۔اپنے مرجع تقلید کے احکام کے مطابق زندگی بسر کرنا چاہیے اور اپنے آنے والے امامؑ کے عہد ظہور کے لیے حالات کو ہموار وسازگار بنانے کے لیے معاشرے کو جس طرح بھی ممکن ہو دین کا واقف کار اور مذہب کا پابند بنانا چاہیے۔

صرف اچھی بات نہیں بلکہ سچی بات

عالم انسانیت ہزاروں سال سے رواج کی عظیم مصیبت میں گرفتار ہے۔جس سے قبل ظہور حضرت حجتؑ چھٹکارا دشوار ہے۔رواج کی یکسر مذمت مقصود نہیں ہے کیونکہ اچھی باتوں کا رواج قابل مدح ہے۔قابل مذمت نہیں ہے لیکن اولاً تو اکثر رواج غلط اور برے ہیں۔دوسرے کسی اچھی بات کا رواج اگرچہ اچھا ہے مگر رواجی اچھائی اس لیے بے قیمت ہے کہ اس کی اچھائی اس کے رواج کا سبب نہیں ہوتی ہے۔ بلکہ رواج اس کی اچھائی کی بنیاد بنتا ہے۔جبکہ رواج خود بے بنیاد چیز ہے۔لہٰذا اچھائی کی اچھائی کو جب رواج کا گھن لگ جاتا ہے تو اس کی خوبی ختم ہوجاتی ہے۔صرف اس کا رواج ہی رواج باقی رہ جاتا ہے۔مذہب رواج کا مخالف ہے۔وہ شریعت کو نافذ کرنے آیا ہے اور رواج کو اکھاڑ پھینکنا چاہتا ہے۔مگر اولاد آدم کا دشمن جانی شیطان اپنی ایمان دشمن تدبیروں کے ذریعہ روزانہ نت نئے رواج جاری کرتا رہتا ہے۔جس میں بعض کو ''مقدس رواج'' کی حیثیت حاصل ہوجاتی ہے۔

چنانچہ عصری مقدس رواج ہے کہ اچھی بات کہی جائے۔ چنانچہ مذہبی اسٹیج پر ذاتی مقاصد کے لیے سیاسی شخصیتیں جمع کی جاتی ہیں جو اچھی بات کہہ کر اپنی آمد اور میزبان کی زحمت کا حق ادا کرتی ہیں اسلام۔ بانی اسلام محافظین اسلام، شہدائے اسلام کے نام پر سمینار ہوتے ہیں۔یوم اور ڈے مناتے ہیں۔اور کردار سے خالی بلکہ بدکرداری

سے مملو شخصیتیں اسٹیج پر بڑے کروفر کے ساتھ جمع ہوتی ہیں بلکہ جمع کی جاتی ہیں جن کی بھرپور پبلیسٹی ہوتی ہے۔ وہ چند اچھی باتیں مجمع کے سامنے کہتی ہیں اور لوگ خوش ہوجاتے ہیں کہ اگرچہ یہ ہمارے خدا ہمارے نبیؐ، ہمارے امامؑ، ہمارے دین، ہمارے اسلام، ہمارے مذہب کو نہیں مانتا ہے مگر پھر بھی اس کی تعریف کررہا ہے۔

پھر اغیار کی ڈگری پر دین کی پابندی سے بالکل آزاد مسلمان بلکہ مومن دانشور چل پڑتے ہیں اور مقالہ، نظم، تقریر کے ذریعہ اچھی باتیں کہتے ہیں اور سمینار، سیرت النبیؐ کے اجلاس اور یوم نبیؐ و امامؑ کی تقریبات مکمل ہوجاتی ہیں۔

جبکہ اسلام صرف اچھی بات کہنے کا پیغام دینے نہیں آیا ہے بلکہ وہ سچی بات کہنے آیا ہے اور اپنے ماننے والے کو پابند کرتا ہے۔ سچی بات کہو، اچھی بات کہنے والے عمل سے آزاد رہتے ہیں صرف زبانی جمع خرچ سے ان کا کام نکل جاتا ہے۔ جبکہ سچی بات کہنے والے کے لیے علم بھی ضروری ہے۔ عمل بھی لازم ہے۔ جری دل بھی درکار ہے۔ اور سچی بات کہنے کی پاداش میں معاشرہ جو سزا دے گا اس کی قوت برداشت بھی درکار ہے۔ انبیا اور ائمہ علیہم السلام نے سچی بات کہنے کی قیمت، قتل ہوکر قیدوبند میں رہ کر، گھٹی زندگی بسر کرکے ادا کی ہے۔ اگر ان کو صرف اچھی بات کہنا ہوتی تو وہ نبیؐ و امامؑ نہ ہوتے بلکہ شاعر ہوتے۔ فلسفی ہوتے، مجذوب ہوتے، بس اچھی بات کہتے اور پھولوں کی سیج پر سوتے، مگر ان کو سچی بات کہنا تھی اور اپنے عہد کی تاریخ انقلاب و جہاد کی سربراہی کرنا تھی۔ لہٰذا صرف اچھی بات کہنے والے ہرگز خدا و نبیؐ و امامؑ کے ماننے والے نہیں بن سکتے۔ ان کو ہر حال میں سچی بات کہنا ہے۔ اور اس کی تلخیاں برداشت کرنا ہیں۔ قرآن مجید کے سورہ عصر میں یہی حقیقت اس طرح بیان کی گئی ہے۔ کہ ہر انسان گھاٹے اور

نقصان میں ہے۔ صرف وہ لوگ گھاٹے اور نقصان سے محفوظ رہیں گے جو

(۱) ایمان لائیں گے یعنی ہر سچی بات کا اقرار و اعلان کریں گے۔

(۲) عمل صالح بجالائیں گے یعنی عملی زندگی میں سچی باتوں کو اپنائیں گے۔

(۳) حق پر چلنے کی وصیت کریں گے یعنی سب کو سچی بات کہنے کی تلقین کریں گے اور عملاً اپنانے کی تبلیغ کریں گے۔

(۴) صبر کرنے کی وصیت کریں گے یعنی سچی بات کہنے، سچی بات کو عملاً اپنانے کی راہ میں جو ذاتی، خاندانی، سیاسی، معاشی، معاشرتی اذیت ناک اور کرب ناک تکلیفیں افراد و معاشرہ اور حکومت کے ہاتھوں اٹھانا پڑیں گی ان پر صبر کرنے اور ان کو برداشت کرنے کی وصیت و نصیحت و تلقین کریں گے۔

اگر زمانہ کو امام زمانہؑ کے ظہور کے لیے مواقف بنانا ہمارا فریضہ ہے تو ہم کو صرف اچھی بات کہنے پر اکتفا نہ کرنا چاہئے۔ بلکہ سچی بات کہنے اور ان کو عملاً اپنانے کی عادت ڈالنا چاہئے۔ واقعۂ کربلا ہم سے سچی بات کہنے کا تقاضا کرتا ہے۔ اگر ہم اس تقاضے کو پورا نہیں کرتے تو خطرہ ہے ہم کو امام زمانہ قبول نہ کریں۔ اگر خدانخواستہ ایسا ہوا تو ہمارا ٹھکانہ دین میں نہ دنیا میں کہیں نہ ہوگا۔

شادی
کس سے کی جائے؟

اس زمانہ کی آواز ہے کہ شادی کا معیار پسند ہونا چاہئے جولڑکا جس لڑکی کو جو لڑکی جس لڑکے کو پسند کرلے ان کو شادی کرنے کی چھوٹ ملنا چاہئے ماں باپ درکنار مذہب کو بھی اس میں رکاوٹ ڈالنے کا حق نہیں ہے پسند کو شادی کا معیار قرار دینے والوں سے جب سوال ہوتا ہے کہ پسند کا کیا معیار ہونا چاہئے تو ان کے پاس کوئی جواب نہیں ہوتا سوا اس کے کہ لفظوں کو دہرا کر کہہ دیں کہ بس پسند تو پسند ہے جس کو جو پسند آجائے یعنی پسند بے معنی اور غیر معیاری بات ہے۔ مذہب پسند پر اسلام کی پابندی لگاتا ہے غیر مسلم سے نکاح کو حرام قرار دیتا ہے البتہ اہل کتاب سے متعہ کو جائز قرار دیتا ہے۔ نکاح اور متعہ کے مسائل میں جو فرق ہے اس سے اس جگہ بحث کی گنجائش نہیں ہے بلکہ اس فرق کی وضاحت کافی ہے کہ نکاح سے گھریلو زندگی بنتی ہے متعہ سے گھریلو زندگی نہیں بنتی ہے اسی بنا پر نکاح اور متعہ میں مذہب نے فرق رکھا ہے۔ پسند پر مذہب ایک دوسری پابندی بھی لگاتا ہے کہ کنواری لڑکی صرف اپنی پسند سے شادی نہیں کرسکتی اس میں اس کے باپ کی اجازت ضروری ہے اگر باپ نہ ہو تو دادا کی اجازت ضروری ہے اس کے علاوہ کسی کی اجازت ضروری نہیں ہے۔

پسند کی شادیوں کا حشر سامنے ہے دھڑا دھڑ شادیاں ہوتی ہیں تڑاتڑ طلاقیں ہوتی ہیں۔ چٹ پٹ رشتے جوڑتے ہیں پھٹا پھٹ جدائیاں ہوتی ہیں۔

پسند کی شادی کے نظریے میں سب سے بڑی خرابی یہ ہے کہ محبوبہ اور بیوی دو کردار دو شخصیتیں قرار دی جاتی ہیں اور اسی وزن پر محبوب اور شوہر بھی دو الگ افراد اور الگ کردار ہوتے ہیں۔ مذہب محبوب اور شوہر، محبوبہ اور بیوی کو ایک رکھنا چاہتا ہے۔ بیوی اور شوہر کے علاوہ کسی دوسرے سے محبت اور جنسی روابط کو بدترین عیب اور سخت ترین جرم قرار دیتا ہے۔ پسند والی شادیوں میں محبت پہلے ہوتی ہے شادی بعد میں ہوتی ہے لہٰذا شادی کے بعد شاید ہی محبت محبت رہ جاتی ہو کیونکہ محبت کا خزانہ تو شادی سے پہلے خرچ ہو چکا ہوتا ہے اور شادی اختتام محبت کا نام ہوتی ہے۔ لہٰذا شادی کے بعد شکایت، رنجش، نفرت ہی باقی رہ جاتی ہے اس کے برخلاف مذہب رہبری کرتا ہے کہ شادی کرو پھر آپس میں محبت کرو محبوبہ کو بیوی نہ بناؤ بلکہ بیوی کو محبوبہ بناؤ تاکہ محبتیں باقی رہیں۔

غرضکہ آج پسند کی شادی کا دور ہے اور پسند کی شادیوں کا زور ہے جس کی گراوٹ کی حد یہ ہے کہ بے حیا ماں باپ لڑکوں لڑکیوں کو ملنے جلنے کے موقع فراہم کرتے ہیں اور نیم باز آنکھوں سے نگرانی کرتے ہیں کہ محبت کی پینگیں پیدا ہوئیں یا نہیں۔ نہیں کی صورت میں افسوس کرتے ہیں مزید مواقع فراہم کرتے ہیں اور ذلیل خواہش رذیل کوشش میں کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ کچھ ملنے کے بجائے وہ دولت عفت بھی کھو جاتی ہے جو پھر کبھی واپس نہیں ملتی اور کبھی گناہوں کے پھل بھی ڈھونا پڑتے ہیں جس کے بعد بڑی قیمت ادا کر کے بھی وہ نہیں ملتے جو ٹھکرائی ہوئی لڑکیوں کو گلے لگالیں اور اگر کوئی مل جاتا ہے تو زندگی پھر قیمت وصول کرتا رہتا ہے۔ پھر بھی ساری زندگی نیچی نگاہ کر کے بسر کرنا

ہوتی ہے۔ یہ ہے پسند کی شادی کے نظریہ کے جہنم کا ایک منظر۔

پسند کے اصول کو مان لینے کے بعد ایک دوسری زحمت یہ پیش آتی ہے کہ پسند ہر فرد کی الگ الگ ہوتی ہے، شادی کرنے والے جوڑوں کی پسند الگ، لڑکی لڑکے کے والدین کی پسند الگ، گھروں اور خاندانوں پر جن لوگوں کی جائز یا ناجائز حکومت قائم ہوجاتی ہے ان کی پسند الگ مختلف افراد کی پسند جب ایک دوسرے سے ٹکراتی ہیں تو سب سے پہلے گھروں میں شادی سے پہلے مہابھارت ہوجاتی ہے ویسے شادی کے بعد تو زندگی بھر ہر گھر میں مہابھارت جاری رہتی ہی ہے۔ ہماری پیاری بھارت ماتا کا آج ہی یہ حال نہیں ہے بلکہ کل بھی یہی حال تھا۔ شادی کے نام پر لڑائیاں ہماری تاریخ رہی ہیں البتہ کل مورچے اور تھے اور آج محاذ اور ہیں۔ کل ہڈی پر جائداد پر، وثیقہ پر، جہیز پر، شادیاں ہوتی تھیں۔ آج ڈگریوں پر، سروس پر، ڈانس کی مہارت پر، ترقی پسندی یعنی بے حیائی پر، بالائی آمدنی وغیرہ پر شادیاں ہوتی ہیں۔ لڑکی کے والدین کا انداز فکر یہ ہے کہ لڑکا والدین کا مطیع ہے لہٰذا یہ رشتہ بیکار ہے۔ لڑکے کے متعدد بھائی بہن ہیں لہٰذا لڑکی زحمت میں رہے گی۔ البتہ والدین کا اکلوتا ہے لہٰذا اچھی نسبت ہے بلکہ اگر والدین بھی مرچکے، فرزند سعید نے والدین کو عاق کر رکھا ہے تو اس سے اچھی نسبت کیا ہوگی۔ ہماری لڑکی دندناتی ہوئی زندگی بھر راج کرے گی حالانکہ یہ نہیں سوچتے کہ والدین واعزا سے چھڑوا کر تم جس رشتہ کی بنیاد رکھو گے یہ تم کو بھی چھوڑ دے گا۔

لڑکے والوں کا انداز فکر یہ ہوا ہے کہ لڑکی والے صاحب اثر و رسوخ ہیں ان کے ذریعہ ملازمت مل سکتی ہے۔ ترقی مل سکتی ہے۔ فارن جانے اور تعلیم حاصل کرنے کے چانس مل سکتے ہیں۔ بزنس کے مواقع مل سکتے ہیں۔ لہٰذا لڑکی کیسی بھی ہو یہ رشتہ چھوڑنا

نہیں چاہئے۔

چند رائج الوقت پسندوں کا اجمالی ذکر کیا گیا باقی آپ تو ہم سے زیادہ واقف ہیں۔ آج شادیوں کی منڈیاں قائم ہیں۔ ایجنسایاں ہیں مگر مسائل ہیں کہ حل ہونے کے بجائے بڑھتے ہی جاتے ہیں۔ الجھتے ہی جاتے ہیں۔ ہم لکھنؤ میں ترکاری منڈی کے سامنے رہتے ہیں۔ آموں کی منڈی کا حال دیکھا ہے۔ پنڈلی پنڈلی تک کیچڑ ہوتی ہے۔ سڑے آموں کی بدبو الگ، برسات میں بھیگی گٹھلیوں کی سڑاندا الگ کہ سانس لینا ممکن نہیں، متلی رکتی نہیں، قے ہوتی نہیں، گھبرائے ہوئے گاہک آموں کے ڈھیروں کی طرف متوجہ ہو رہے ہیں جبکہ چھان بین کی صلاحیت کھوچکے ہیں ایجنٹ، بیوپاری، آدمی، جانور سب کے ملے جلے شور میں کان پڑی آواز نہیں سنائی دیتی، کیا پوچھیں کیا سنیں مال کیا پرکھیں، دام کیا لگائیں کیونکہ دم پر بنی ہے۔ خالی ہاتھ جائیں تو گھر کیا منھ لے کر جائیں۔ لے جائیں تو کیا لے جائیں کیونکہ پوری مہارت کے ساتھ عیاری، فریب کاری کے نمونہ موجود ہیں ایک ڈھیر میں مختلف قسم کے آم شامل ہیں اندر سے کچے ہیں اوپر سے خوش رنگ ہیں۔ غرضکہ جو کچھ مل سکا اس کو اٹھالائے۔

یہی حال آج شادی کی منڈی کا ہے۔ کس کو پسند کریں۔ صورت، جہیز، سروس، ایڈوانس فیملی، غرضکہ نظر پھسلتی جاتی ہے کسی جگہ رکتی نہیں۔ اگر کہیں رکی تو دوسرا اس سے بہتر نظر آ گیا۔ طے نہیں کر پاتے کسے پسند کریں کسے چھوڑیں، کس کے لیے کس کو چھوڑیں، چھوڑ پکڑ کا سلسلہ کب تک جاری رکھیں۔ وعدے توڑیں اور اپنا گھر بھرلیں اور دوسروں کے گھر کو غموں سے بھردیں۔ رشتے توڑ کر، شرافتیں بیچ کر بھی دل غیر مطمئن ہرتا ہے کہ سودا صحیح ہوگیا یا چوک گئے۔ لڑکی لڑکے والے دوطرفہ دوڑ دھوپ جاری رکھتے ہیں۔

کنویسنگ ہوتی رہتی ہے۔ وعدے ہوتے ہیں اور وعدوں کے خلاف کھُسر پھُسر بھی جاری رہتی ہے۔خرید وفروخت کا بازار گرم ہے دھنا سیٹھ دام چڑھا کر نیلام چھڑانے کے لیے تیار بیٹھے ہیں اور غریبوں کی لڑکیوں کو زندہ درگور کرنے کا سامان کر رہے ہیں۔

غرضکہ شادی کی اس منڈی میں جو نظر ہے وہ للچائی ہوئی۔ جو آنکھ ہے خود غرضی کا آئینہ ہے۔ پسند کی کیچڑ میں سر سے پیر تک لت پت ہیں۔ جھوٹ فریب بدنفسی کی سڑاند ماحول پر چھائی ہوئی ہے۔ کچے مالوں کو صورت فیشن، سروس، ڈگری، جہیز وغیرہ کے مسالوں سے خوش رنگ بنایا گیا ہے۔ کردار، سیرت، انسانیت اس منڈی میں ناپید ہے۔بس مختصر یہ ہے کہ حرص وہوس و پست فطرتی کی مکھیاں بھن بھنا رہی ہیں مال پیک ہو رہا ہے۔ٹرک روانہ ہو رہے ہیں۔

جن کا مال بک گیا وہ لٹ گئے جنہوں نے لوٹ لیا ان کے دل کی حسرتیں نہ نکل سکیں یہ ہے پسند اور دنیاوی شادیوں کا حال۔

اس کے برخلاف مذہب شادی کا معیار، دینداری کو قرار دیتا ہے۔ جناب معصومہؑ کی یہی تعریف جناب امیرؑ نے حضور سے فرمائی تھی کہ عبادت واطاعت خدا میں مددگار بلکہ بہترین مددگار پایا دینداری کے معیار پر لڑکی لڑکے اور خاندان منتخب کیے جائیں تو جہیز کا بوجھ فرمائشوں کی بھرمار بلکہ لوٹ مار بند نہ ہوگی تو کم ضرور ہو جائے گی۔ دوسرے کے حقوق اور اپنے فرائض کا احساس رہے گا۔ اولاد دیندار پیدا ہوگی۔ دینداری کے سہارے برے دن بھی اچھی طرح کٹ جائیں گے۔ زندگی خصوصاً مشترک زندگی حق تلفیوں کے بغیر رواں دواں رہے گی۔ دینداری ہوگی تو صبر وشکر ہوگا بے دینی ہوگی تو بدمستیاں ہوں گی۔ حق تلفیاں ہوگی۔ رازق پر بھروسہ کیجئے۔ اطاعت کو فریضہ قرار

دیجئے۔ کمانے کے بعد شادی ہونا چاہئے کے نظریہ پر نظر ثانی کیجئے۔ شادی کو کمائی کا ذریعہ نہ قرار دیجئے۔ بلکہ خدائی وعدہ پر بھروسہ کیجئے کہ وہ یقین دہانی کراتا ہے شادی کرو غریب ہوگے تو ہم خوش حال بنا دیں گے۔

خدیجہؑ

جن پر شرف زوجیت رسولؐ فخر کرے

تاریخ شاہد ہے کہ شر نے خیر کے مٹانے میں ہر ممکن قساوتِ قلبی سے کام لیا ہے۔ اگرچہ یہ بھی ایک تاریخی حقیقت ہے کہ نہ مٹنے والے خیر نے شر کا نہ صرف بھرپور مقابلہ کیا ہے بلکہ ہمیشہ یہ فتح مبین حاصل کی ہے کہ عاجز آکر شر کی زبان کو خیر کے لیے کلمۂ خیر کہنا پڑا۔ خیر ہی وہ جادو ہے جو شر کے سر پر چڑھ کر ہمیشہ بولتا رہا ہے نگاہِ عالم نے بارہا دیکھا ہے کہ شر کی مرکزی اور محوری طاقتوں کی گود میں خیر کے گواہ پیدا ہوتے رہے ہیں۔

تاریخ نویسی کا مدعا!

کُل ایمان اصل واصول خیر مولائے کائنات حضرت علی ابن ابی طالب علیہ السلام کی جو مخالفت اور عداوت کی گئی ہے اس میں کوئی انصاف کبھی روا نہیں رکھا گیا ہر طرح کی حق پوشی بلکہ ممکن حد تک گمراہ کن کوششوں سے کام لیا گیا۔ تاریخ نویسی کا اصل مدعا یہی ہے کہ واقعات اور شخصیتوں کو ان کے صحیح اور سچے خدوخال میں پیش کیا جائے تاکہ ماضی کی شمع مستقبل کے اندھیرے اور اجالے کو واضح کر سکے اور انسانی توانائیوں کو

نہ صرف نقصان سے بچ نکلنے کا موقع ملے بلکہ ملکوتی کمالات سے آگے تک جانے اور نشو ونما کا موقع ملے۔ مگر برا ہو تعصب، جنبہ داری اور سفلہ جذبات کا کہ صدیوں سے تاریخ لکھنے کے نام پر چاند پر خاک ڈالنے کی اور سیاہ ومکروہ چہروں پر ''تاویلاتی میک اپ'' کرنے کی کوشش جاری ہے یہ اور بات ہے کہ چاند پر کا تھوکا ہوا خود اپنے ہی منہ پر آتا ہے اور تاویل سے مکروہ چہروں کی کراہت میں کئی گنا اضافہ ہو جاتا ہے۔ حق پوشی وباطل کوشی کی تدبیروں کا پورا زور مولائے کائنات کے خلاف صرف کیا گیا۔

چنانچہ علیؑ اور اولادِ علیؑ سے جس کا بھی قریبی تعلق رہا ہے لکھنے والوں نے ہر ایسی شخصیت سے ممکن گریز کیا بلکہ ان شخصیتوں کو بدنام کرنے میں کوئی دقیقہ نہیں اٹھا رکھا گیا ہے۔

ہمارا فرض!

جناب ام المومنین حضرت خدیجہؑ کے ذاتی کمالات، آپ کی غمگساری نبوت، نصرتِ اسلام، سب کو معلوم ہے اور بلاشبہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ آپ رفیقۂ حیات سے زیادہ رفیقۂ مقصد تھیں۔ آپ کا درجہ فہرست ازواج میں سب سے بلند ہے لیکن یہ شکوہ بھی ایک تاریخی حقیقت ہے کہ تاریخ لکھنے والوں نے آپ کے بجائے کسی اور ہی کو ''مادرملت'' کی حیثیت سے پیش کیا ہے۔ ہر شخص اپنے فعل کا ذمہ دار ہے اور ہر ایک کا عمل اس کے جذباتی عوامل اور اس کے پسندیدہ تحریکات کے زیر اثر انجام پاتا ہے۔ مولیٰ سے وابستگی رکھنے والوں کا ویسے بھی فرض تھا کہ مولیٰ سے وابستہ ہر شخصیت پر زیادہ سے زیادہ لٹریچر شائع کرتے لیکن اب جبکہ ان شخصیتوں کو غیر اہم قرار دینے یا بدنام کرنے کی کوششوں کا نہ

ختم ہونے والا سلسلہ بھی جاری ہے تو ان حالات میں اور زیادہ ضروری ہو جاتا ہے کہ ہر شخصیت کو زیادہ سے زیادہ اجاگر کیا جائے۔ان ذروں کو بھی فراموش نہ کیا جائے جنہوں نے آفتابِ امامت سے کسب ضیاء کیا ہے چہ جائیکہ مادرِ اسلام وایمان جناب خدیجہؑ۔ آپ کی زندگی پر جتنا بھی لکھا جاتا وہ کم ہے۔قابلِ مبارک باد ہیں عالی جناب مولانا سید کرار حسین صاحب واعظ جنہوں نے جناب خدیجہؑ کے حالات پر کتاب لکھی۔مولانا کے قلم سے بہت سی کتابیں نکل چکی ہیں اور بے پناہ مقبولیت حاصل کر چکی ہیں۔اس لیے تعریف وتعارف بے ضرورت ہے بلکہ سعی لا حاصل ہے۔

جہاں مولانا کی کتابوں کا مقبول ہونا قوم کی قدر دانی ہمت افزائی اور علم دوستی کی دلیل ہے وہاں اس سے یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ ذوق قومی ابھی صحیح حدوں پر باقی ہے ورنہ اس دور انحطاط میں جبکہ سطحیت ابھار کر رہی ہے تخریب کاری کو تعمیر واصلاح کا رنگ دیا جارہا ہے اور ''مداری کا تماشہ'' پر مجمع کو جمع ہونے کی عادت ہو چکی ہے علمی کام کرنا تالیفات وتصنیفات میں خونِ جگر کھپانا آسان کام نہیں ہے۔خصوصاً جبکہ اپنے اور غیر سبھی کے عتاب کا خطرہ ہو۔اور نوبت یہاں تک پہنچ چکی ہو کہ بیان مظلومیت اہل بیت علیہم السلام کو تنگ نظری قرار دیا جارہا ہو اور عقائد وحقائق سے ہٹی ہوئی بین الاقوامیت کو خوش آمدید کہا جارہا ہو۔ان حالات میں تصنیف وتالیف جیسے خشک کام میں دلچسپی لینا ہمت کا کام ہے،اس کام کے کرنے والوں کو طعن وتشنیع ناقدری وہمت شکن سنگدلانہ نکتہ چینی بلکہ بلا وابتلا کے لیے اپنے کو پہلے سے تیار رکھنا چاہئے۔مقہور ومظلوم معصومینؑ کا دردمند قاہر قوتوں اور جابر اافراد کے ہاتھوں نشان قہر وظلم بنتا رہے گا۔معصومین علیہم السلام ہی ایسے افراد کی دستگیری فرمائیں گے۔اور ان کو اطمینان رکھنا چاہئے کہ جب ایسے پر قوت

صاحبان امران کے دستگیر ہیں تو وہ انشاءاللہ ہر بلا وشر سے محفوظ رہیں گے۔

ضرورت ہے کہ چھوٹے چھوٹے رسالے اور کتابیں کاروان امامت سے متعلق افراد پر لکھی جائیں جن میں جناب خدیجہؑ، جناب ام سلمہؓ، جناب ام البنینؑ، جناب فاطمہؑ بنت اسد، جناب آمنہؑ، جناب حلیمہؓ، جناب اسماء بنت عمیسؓ، جناب فضہؓ، جناب زینبؑ، جناب ام کلثومؑ، جناب ربابؑ، جناب ام لیلیٰؑ، جناب سکینہؑ، حبابہ والبیہ، جناب معصومہ قمؑ، جناب نرجس خاتون، جناب حکیمہ خاتونؑ، وغیرہ کی سبق آموز زندگی پیش کی جائے تاکہ اپنی تاریخ سے عوام اور بچے باخبر ہو سکیں اور ان کی زندگیوں کو مشعل راہ حیات بنا سکیں اور دوسروں نے شرکاء کاروان ہدایت کے تذکروں میں جو بخل کیا ہے اس کی تلافی بھی ہو سکے۔ام المومنین جناب خدیجہؑ کا تذکرہ صرف اس لئے مدھم کر دیا گیا کہ وہ ابناء علیؑ کی نانی تھیں اگر صرف حضورؐ کی بیوی ہوتیں تو ان کا تذکرہ اس طرح بے رخی کا شکار نہ ہوتا۔اگرچہ وہ التفات خاص جو نبیؐ کی کسی مخصوص زوجہ کو حاصل ہے وہ پھر بھی حاصل نہ ہوتا کیونکہ جناب خدیجہؑ کسی ایسے فرد کی بیٹی یا بہن نہ تھیں جس کے گرد اکثریت کی عقیدت گردش کرتی ہے۔

مُربی اسلام!

اسلام ہر ضعیف وناتواں کا ہمدرد وغمگساری حلال مشکلات خبر گیر ودستگیر بن کر آیا آج اسلام کے تناور درخت کے نیچے کروروں انسان سکون واطمینان محسوس کر رہے ہیں سرسبزی وشادابی شجر اسلام کا ایک انوکھا ثبوت یہ ہے کہ صدیوں ملوکیت کی عنبر بیل اس تناور درخت پر پھیلی رہی اگر اس درخت کی جڑیں کم گہری ہوتیں تو جس

طرح عنبر بیل کمزور درختوں کو خشک کر دیا کرتی ہے اسلام کا یہ پُرثمر اور بار آور درخت خشک ہو گیا ہوتا۔ لیکن اس کے برخلاف ملوکیت ختم ہو چکی سیاسی آروں نے اس درخت کی بے شمار شاخین کاٹ ڈالیں آج بھی اختلاف نوکِ قلم و زبان سے اس درخت کے ریشوں کو نوچتے رہتے ہیں۔ دانستہ اور نادانستہ طور پر اپنے اور پرائے سبھی اس کے برگ و بار کو خزاں رسیدہ بنانے کے لیے کوشاں ہیں مگر کوئی غائبانہ آبیاری روز بروز اس کی تازگی میں اضافہ کرتی جاتی ہے غرض کہ کہنا یہ ہے کہ آج کا یہ تناور درخت جس کی چھاؤں بھی اقدارِ انسانی کو نشو ونما کی طاقت بخشتی ہے کل کبھی اپنے ابتدائی دور میں ایک ننھا سا پودا تھا اور خود اپنی بقا و نشو ونما میں کسی کی محافظت اور آبیاری کا محتاج تھا مسلمان چاہے بھول جائیں لیکن اسلام فراموش نہیں کر سکتا کہ اس کے کل کے دور ضعف و ناتوانائی میں کس نے اس کی آبیاری کرنے والی ذات مربیۂ اسلام حضرت خدیجہؑ تھیں۔ ثوارث صفات ایک عام انسانی قانون ہے لیکن صفات میں یکے بعد دیگرے زیادہ پر کمال مظاہرہ توارث صفات کی وہ اعلیٰ منزل ہے جو چودہ معصومین علیہم السلام کی واحد تاریخی خصوصیت ہے۔ چنانچہ تاریک دیکھ سکتی ہے کہ اگر کل خدیجہؑ نے اسلام کی آبیاری اپنی دولت اور پسینے سے کی تھی تو بعد میں اولادِ خدیجہؑ نے اسی شجرِ اسلام کو اپنے خون سے سینچا۔ خدیجہؑ نے سرمایہ صرف کیا تھا اولاد خدیجہؑ نے سرمایۂ حیات صرف کیا۔ شہادت کی جو نہریں نسل معصومینؑ میں جاری ہوئیں ان کا منبع اور مرکز دودھ کی وہ دھاریں تھیں جو سینہ سپر اسلام خدیجہؑ نے محافظین اسلام کی ماں فاطمہ زہراؑ کی طرف منتقل کی تھیں۔

''دور معراج'' کی بیوی

زوجیت رسولؐ ایک رشتہ ہے جس سے اہل و نا اہل دونوں وابستہ ہو سکتے ہیں۔ زوجۂ جناب نوحؑ، وجناب لوطؑ کی نافرمانیاں اور جناب سارہؑ، اور ہاجرہ کی فرمانبرداریاں تصویر کے دونوں رخوں کو پیش کرتی ہیں۔ مگر زوجیت رسولؐ ایک شرف بھی ہے اگر بیوی نبیؐ سے رشتہ پر نازاں نہ ہو بلکہ اس کمال و کردار کے لیے کوشاں ہو جو شریکہ حیات نبیؐ کے شایان شان ہو۔ یہ شرف حسب صلاحیت و استعداد اور مطابق سعی و کوشش ازواج مطہرات انبیاء نے حاصل کیا ہے۔ تاریخ میں ہر ایک ے کردار کا پرچم اتنا ہی اونچا ہے جس طرح صاحب معراج نبیؐ تک نبوت کو پہنچنا معراج نبوت ہے اسی طرح شرف زوجیت نبیؐ کی معراج بھی یہی ہے کہ وہ اس خدیجہؑ تک پہنچی جو مرسل اعظم کی زندگی کے ''دور معراج'' کی بیوی ہیں۔ ازواج انبیاء کی فہرست کی اونچ نیچ کو دیکھتے ہوئے یہ کہنا بے محل نہ ہوگا کہ رسولؐ کی بیوی ہونا اور ہے اور خدیجہؑ ہونا اور ہے۔

مرد اور عورت.....!

اگر انسانی کمالات بشری اخلاق اور اشرف المخلوقات کی توانائیوں کی نشو ونما تعلیم و تربیت کی تکمیل ''یک جنسیت'' کے ذریعہ ممکن ہوتی تو علیم و حکیم خالقِ انسان کی دو صنفیں عورت اور مرد کی شکل میں نہ پیدا کرتا عورت اور مرد انسانیت کی دو آنکھیں ہیں بشریت کے دو ہاتھ ہیں اور اشرفیت کی بلند چوٹی کو سر کرنے والے دو قدم ہیں۔ ''یک جنسی'' زندگی عیوب و نقائص سے اپنا دامن نہیں بچا سکتی۔ استقامت کے بجائے کجی اور

لنگ کا شکار رہے گی۔ یک چشمی یعنی انتہا پسندی کا ہدف بنے گی اور غیر فطری ومصنوعی خشک وبے جان نظریات واصول کی بیساکھی اور عصا کا سہارا لینے پر مجبور ہوگی۔سکون کی چھاؤں سے محروم اور بے چینی کی کڑی دھوپ کا شکار رہے گی۔خوشگوار زندگی چاہے وہ انفرادی ہو یا اجتماعی اس کا حصول تب ہی ممکن ہے جب حالات کی مجبوری اور دباؤ کے زیر اثر قبول کرنے کے بجائے حقیقی اور خوش آیند تصورات اور اصول کے پیش نظر یہ بات بخوشی منظور کر لی جائے کہ عورت اور مرد دونوں ایک دوسرے کے محتاج بھی ہیں اور محتاج الیہ بھی۔ نہ ان میں سے کوئی دوسرے سے مستغنی ہوسکتا ہے اور نہ ان میں کوئی خود کفیل ہوسکتا ہے۔مرد اپنے مکمل کردار کے باوجود اس خلاء کو پُر نہیں کرسکتا جس خلاء کو پُر کرنے کے لیے خالق نے عورت کو پیدا کیا ہے۔ اسی طرح عورت نہ خود پُر سکون و پُر مسرت زندگی بسر کرسکتی ہے اور نہ دوسروں کو شادمانی وخوشی دے سکتی ہے جب تک مرد اس کی کفالت ومحافظت کا بوجھ نہ اٹھالے۔عورت کا خود کفالتی کے لیے کوشاں ہونا ایسے دوگنے بوجھ کے اٹھانے کے مترادف ہے جس کے اٹھانے کی طاقت اسے فطرت اور قدرت نے نہیں دی ہے۔اسی طرح مرد کا صنف نسواں سے بے نیازی کے اصول پر زندگی کا تعمیر کرنا ایسی مجنونانہ کوشش ہے جس میں کامیابی ممکن نہیں۔ بلکہ اپنے ہاتھوں اپنی زندگی کو کرب واضطراب میں مبتلا کرنا ہے۔ مجھے حیرت ہے کہ جب دانشور عورت اور مرد کے موضوع پر گفتگو کرتے ہیں تو ان کے شعور یا تحت الشعور میں صرف شوہر اور بیوی کا تصور رہتا ہے حالانکہ عورت ماں بھی ہے بہن بھی بیٹی بھی بیوی بھی اور سہیلی بھی اسی طرح مرد باپ بھی ہے بھائی بھی بیٹا بھی شوہر بھی اور دوست بھی۔اور دونوں مذکورۂ بالا حیات کے ہر رخ میں انسان بھی ہیں اگر مسئلہ کو مذکورۂ بالا تفصیلات کی روشنی میں دیکھا جائے تو وہ

تمام دوراز کار بحثیں جن میں یک طرفہ ظلم ومظلومی کی داستانیں بیان ہوتی ہیں وہ خود بخود ختم ہوجائیں۔مشہور بات یہی ہے کہ عورت پر مرد ظلم کرتا آیا ہے لیکن کیا اس عالمی شور کے درمیان ہے کوئی جو اس آواز کی طرف بھی دھیان دے کہ مرد کے ہاتھوں عورت پر ہونے والے اور لرزہ براندازم کردینے والے مظالم کے پیچھے ہمیشہ کسی عورت ہی کا ہاتھ رہا ہے وہ عورت چاہے ساس ہو یا بہو،نند ہو یا بھاوج،سوت ہو یا طوائف، پڑوسن ہو یا سہیلی ہے آج کوئی جو حساب کرکے بتائے کہ مرد کی سنگدلی نے عورت کے زیادہ آنسو بہائے ہیں یا عورت کے آنسو نے مرد کے ذریعہ ظلم وشقاوت کے کھولتے چشمے زیادہ جاری کئے۔ مجھے تو تاریخ میں یہی نظر آتا ہے کہ عورت روتی بھی رہی ہے اور عورت ہی عورت کو آٹھ آٹھ آنسو رلاتی بھی رہی ہے۔عورت سے متعلق تاریخی تذکرے کے دو حصے نظر آتے ہیں۔ایک حصہ مظلومیت کا ہے اور دوسرا حصہ ظلم وجور کا۔لیکن دونوں حصوں کے دریان ایک پردہ پڑا ہے اور اس پردے کا نام مرد ہے۔ یہ صحیح ہے کہ عورت صنف نازک اور مرد صنف قوی ہے لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ صنف قوی کا دل اور اس کے محرکات عمل صنف نازک کے پنجہ اور قبضہ میں ہے۔غرض کہ بشری حیات کی خوشگواری کے لیے صدق دل کے ساتھ نہ کہ عبوری مصالح کے لیے اس اصول کو تسلیم کیا جائے اور معاشرت واجتماعی زندگی کی بنیاد اس اصول پر رکھی جائے کہ عورت مرد ایک دوسرے کے لیے لازم بھی ہیں اور ملزوم بھی۔ایک دوسرے کے حاجت مند بھی ہیں اور مددگار بھی۔ زندگی کو اونچا اٹھانے کے لیے ضرورت ہے کہ عورت اور مرد کے درمیان باہمی جنگ وجدال یا غلبہ وتفوق کی لڑائی کے بجائے پر امن تقسیم کار کے اصول پر فرائض وحقوق کی تعیین وتقسیم کی جائے۔اگر ان میں سے کوئی ایک بھی دوسرے سے بے نیاز ہوسکتا ہوتا تو

جنت پا کے جناب آدمؑ خواہش جناب حوا نہ کرتے اور جنت سے نکل کر حوا فراق آدمؑ کے
لیے فراق جنت سے زیادہ مضطرب نہ ہوتیں اگر جنت کا فرق جناب آدمؑ کے فراق سے
زیادہ گراں ہوتا تو آدمؑ کے پانے کے بعد اضطراب حوا زائل نہ ہوتا۔ معلوم ہوا کہ عورت
مرد کی جنت نہیں ہے بلکہ جنت سے بہتر ہے اور جنت عورت کے لیے مرد سے کمتر ہے۔

شریک کارِ رسالت!

ادب کا مقام ہے نازک اور لطیف محفل بحث ہے لیکن پھر بھی یہ کہنا ضروری ہے
کہ مرسل اعظم نہ صرف نبیوں میں سب سے افضل تھے بلکہ آپ کی ذات ستودہ صفات،
کمالات کی ان معراجی منزلوں پر فائز تھی جس کے آگے وسیع دائرۂ امکان میں گنجائش نہ
تھی یا یوں کہئے کہ خالق جود وسخا، خدا جو کچھ دے سکتا تھا وہ سب کچھ اس نے جسے دیا اس کا
نام زمین پر محمد اور آسمان پر احمد تھا۔ بے شک زبان و ذہن عاجز ہے کہ وہ عظیم خدا کی عظیم
ترین اور اول مخلوق کی ثناء وصف کر سکے یا ان کی عظمتوں کو احاطۂ خیال میں لا سکے لیکن اسی
کے ساتھ ساتھ یہ بات بھی جان لینا بلکہ مان لینا ایمان و دیانت کے لیے ضروری ہے کہ
کائنات کی سب سے اونچی ذات کائنات کو کردار وکمال میں اونچا اٹھانے کے جس مشن پر
دنیا میں نبیؐ بلکہ خاتم النبیین بن کر آئی یہ مشن اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہوسکتا تھا جب
تک ساتھیوں، نام لیواؤں، کلمہ گویوں کے عوام وخواص کے مجمعوں کے علاوہ کچھ ایسے
افراد شریک کار نبوت نہ بن جائیں جن کا اندازِ فکر بھی اتنا ہی اونچا ہو جتنا اونچا اندازِ فکر
مرسل اعظمؐ کی تھی۔ غرض کہ جب تک فکر ونظر، علم وعمل، کردار وکمال میں حضور کے مساوی
قلب ودماغ والے آپ کے شریک کار نہ ہو جائیں اس وقت تک کلم الناس علی قدر عقولھم

(مخاطب سے اس کی عقل کے مطابق گفتگو کرو) کا حکم دینے والا نبیؐ اپنے دل کی بات کس
سے کہتا اور اپنے بعد اپنے بلند پایہ اور عظیم مشن کو کس کے حوالے کرتا اسی لیے امامت کو
شریک کار نبوت بنایا گیا۔ لیکن ایک وقت وہ بھی تھا جب رسالت کی مددگار عظیم امامت
صرف دس سال علیؑ کی شکل میں موجود تھی۔ مشن کا آغاز تھا، دنیا ناواقفیت بلکہ جاہلانہ
عداوت پر اڑی تھی جاہلیت کی خشک اور پتھریلی چٹانوں کو توڑ کر اسلام کے چشمہ کی ننھی
دھار نکلنا چاہتی تھی اس وقت ضرورت تھی کچھ افراد کی جو اگر چہ نبیؐ کے ہم رتبہ وہم پلہ نہیں
ہو سکتے تھے اس لیے کہ سلسلہ عصمت کا آغاز تھا یعنی صرف علیؑ موجود تھے مگر ایسے افراد
ہو سکتے تھے جو غیر معصوم کمال کی حد ہوں جن سے نبیؐ اپنے دل کی بات کہہ سکیں جن کے
ہاتھوں اپنے عظیم مشن کی عمارت کا سنگ بنیاد رکھوا سکیں اگر سنگ بنیاد رکھنے والے افراد
کے کردار میں ذرا بھی کجی رہتی تو اسلام تبلیغ کے ثریا تک پہنچ جانے کے باوجود کج ہی رہتا۔
نبیؐ نے ایسے افراد ڈھونڈھ لئے بلکہ ان افراد نے اپنے بلند ذوق کی تکمیل کے لیے خود نبی
کو ڈھونڈھ نکالا۔ اسی تلاش کنندہ کا نام ''خدیجہؑ'' ہے۔

علم وعرفان کی مالک!

عقد رسولؐ میں آنے سے پہلے خدیجہؑ ''ملیکۃ العرب'' تھیں عربی غرور ساری
دنیا کو اپنے سے کمتر سمجھتا تھا سارے عرب میں قریش کی فضیلت مسلم تھی قریش میں جناب
خدیجہؑ ملیکۃ العرب تھیں یعنی عربی افتخار کے ہمالیہ کی دو بلندترین چوٹیاں تھیں ایک شیخ بطحا
ابوطالبؑ دوسری ملیکۃ العرب خدیجہؑ۔

اس عزت واحترام کے علاوہ خدیجہؑ دولت وثروت میں بھی اپنا نظیر نہیں رکھتی

تھیں آج سے چودہ سوسال کی دنیا میں جبکہ ذرائع آمد ورفت وسائل حمل ونقل بے حد محدود اور غیر ترقی یافتہ تھے اس وقت بھی مکہ میں مقیم خدیجہؑ کی تجارت نہ صرف عربی حدود میں پھیلی ہوئی تھی، بلکہ عرب سے باہر دوسرے ملکوں تک ان کا سلسلۂ تجارت پہنچا ہوا تھا غرضکہ دنیا جب قومیت میں تقریباً محدود تھی۔ جناب خدیجہؑ کی تجارت اس وقت بھی بین الاقوامی تھی۔ عزت ودولت کی مالک خدیجہؑ علم وعرفان کے درمیان زندگی بسر کر رہی تھیں۔ دنیا جب جہالت اور عرب جس وقت جاہلیت کے گہرے اندھیرے میں تھے اس وقت آسمانی علوم اور آسمانی کتابوں کا ایک علمی فانوس تھا جس میں جناب خدیجہؑ کی شمع حیات روشن تھی۔ ورقہ بن نوفل وغیرہ آپ کے اعزہ آسمانی کتابوں اور الٰہی علوم کے زبردست عالم تھے۔ جناب خدیجہؑ ابن علمی مباحث میں شریک رہتی تھیں جو اس وقت ان صاحبان علم افراد کے درمیان ہوتے رہتے تھے۔ مباحثۂ علمی میں شرکت کا چرچہ آج بھی تاریخ میں موجود ہے۔

غرض کہ جناب خدیجہؑ عزت واحترام، دولت وثروت، علم وعران کی ان اونچی حدوں پر فائز تھیں جن میں سے کسی ایک فضیلت میں بھی کوئی ان کا ہمسر نہ تھا لیکن اس کے باوجود بین الاقوامی تجارت کی تن تنہا مالک ملیکۃ العرب خدیجہؑ نے اپنے بلند پایہ علمی اور عرفانی ذوق کی روشنی میں مرسلِ اعظمؐ کو دیکھا جانا اور پہچانا سمجھا اور پرکھا اور خود خواہش کی کہ رسول اعظمؐ سے قربت حاصل کریں۔ مرسل اعظمؐ کے عقد میں آئیں اور حسنات کی گہری جھیل کمالات کے اتھاہ سمندر میں جا ملی۔

شرف زوجیت رسولؐ جس پر ناز کرے!

سطحی ذہن ظاہر بین نظریں خدیجہ کی دولت کے آگے ان کی پُر کمال ذات کو نہ

دیکھ سکیں چنانچہ آپ سے متعلق سب سے پُر زور تذکرہ یہی ہے کہ آپ کی دولت نے اسلام کی مدد کی۔ مجھے بھی اقرار ہے کہ اسلام جناب خدیجہؑ کی دولت اور جناب ابوطالبؑ کی قوت کے ذریعہ پروان چڑھا لیکن فخر کائنات سربراہ تبلیغ نبیؐ کو خدیجہؑ کی شکل میں کیا کچھ ملا اسے ہلکے دماغ کی دنیا کیا جانے نبیؐ کو ازدواجی زندگی کے لیے صرف ایک شریک حیات کی ضرورت نہ تھی بلکہ اس عظیم نبیؐ کو ایک ایسی شریک کار اور رفیق مقصد صنف نسواں کی منتخب ہستی کی ضرورت تھی جو تبلیغی مشکلات میں نبوت کی غمگسار بن سکے جس سے اس کا وہ شوہر جو فخر بنی آدمؑ ہو اپنے عظیم اور مشکل کام میں اپنے دل کی بات کہہ سکے، درد دل سنا کر دل کا بوجھ ہلکا کر سکے۔ اس ضرورت کو مکمل طور پر جناب خدیجہؑ نے پورا کیا۔ آپ کی وفات کے بعد حضورؐ نے بہت سے عقد فرمائے۔ ہر طرح کے مزاج، کردار، سن وسال کی بیویاں آئیں جن کا افتخار ''زوجیت رسول'' تھا۔ خود ازواجِ رسولؐ نے اور ان کے اعزہ اور متوسلین نے اس افتخار کو اپنا عزیز ترین سرمایہ کمالات قرار دیا۔ حسبِ ذوق ومقاصد کچھ ازواج نبیؐ اور ان کے متوسلین نے مسلمانوں میں مادی اور روحانی اقتدار حاصل کیا جس کے باقی رکھنے کی سعی پیہم اب بھی جاری ہے لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ ''زوجیت رسول'' کے شرف پر جو فخر کرے وہ رسولؐ کی بیوی ہے اور ''شرف زوجیت خاتم الانبیا'' جس ذات پر فخر وناز کرے اس کامل ومکمل ہستی کا نام خدیجہؑ ہے۔

فضائل وکمالات کی معراج!

مولائے کائنات امیر المومنین علی بن ابی طالب علیہ السلام اور ملیکۂ کائنات جناب فاطمہ زہرا صلوٰۃ اللہ علیہا کا شمار چودہ معصومینؑ میں ہے ہر معصوم نقائص سے بالاتر

پیدا ہوتا ہے لیکن چودہ معصومینؑ وہ کامل ترین افراد ہیں جن کی ہستیوں تک پہنچ کر فضائل وکمالات کی معراج اور تکمیل ہوتی ہے۔ان کے بارے میں یہ تصور بھی ناجائز ہے کہ کوئی کم درجہ کی فضیلت یا کمال ان میں پایا جاتا تھا بلکہ فضائل وکمالات جس آخری حد تک ترقی کر سکتے تھے وہ اپنی انتہائی ترقی یافتہ شکل میں ان حضرات میں پائے جاتے ہیں ان کو نہ تعلیم وتربیت کی ضرورت ہے نہ یہ توارث صفات کے محتاج ہیں لیکن وہ لوگ جو ان بہترین انسانوں کے بارے میں مذکورہ بالا عقیدہ نہیں رکھتے جو ان کامل انسانوں کو رواجی تعلیم وتربیت، تدریجی اور ارتقائی نشوونما کے اصول پر ترقی کمالات کا شاہکار مانتے ہیں وہ بھی اس بات میں متفق ہیں کہ کمالات خدیجہؑ کی ترقی کا نام فاطمہ زہراؑ ہے اور کمالات ابوطالبؑ کی ترقی کا نام علیؑ ہے۔

جناب خدیجہؑ کی زندگی میں حضور نے کوئی دوسرا عقد نہیں کیا۔اسی طرح جناب امیرؑ نے حیاتِ معصومہؑ میں کوئی دوسرا عقد نہیں کیا۔ وفاتِ خدیجہؑ کے بعد حضورؐ بھی خدیجہؑ کو فراموش نہ فرما سکے بلکہ ہمیشہ آپ کا تذکرہ فرماتے رہے جو رقیبانہ مزاجوں کو ناگوار بھی ہوتا رہا اور بارہا تذکرۂ خدیجہؑ پر ایسی نکتہ چینی بھی کی جاتی تھی جس سے قلبِ رسولؐ کربناک ہوجاتا تھا مگر اس کے باوجود خدیجہ کا ذکر خیر وحی ترجمان نبیؐ کی زبان پر جاری رہتا تھا۔ اسی طرح وفات جناب معصومہؑ کے بعد جناب امیرؑ نے متعدد عقد فرمائے لیکن نبیؐ کی طرح وصیؑ بھی تاحیات ذکر معصومہؑ کرتا رہا۔ مذکورہ بالا حالات سے جہاں نبیؐ ووصیؑ کے اتحاد مزاج اور یکسانیت کردار کا پتہ چلتا ہے وہاں یہ بھی صاف ظاہر ہے کہ خدیجہؑ یا فاطمہ زہراؑ کی صورت میں نبیؐ یا وصیؑ کو صنف نسواں کی وہ کامل یا اکمل ہستی مل گئی تھی جن کے بعد صنف نسواں کی کسی دوسری فرد کی ضرورت نہ تھی اور جناب خدیجہؑ یا

جناب معصومہؑ کی وفات کے بعد ان کامل ہستیوں کی زندگی میں ایسا خلاء پیدا ہوگیا تھا جسے بعد میں آنے والی کوئی عورت پُر نہ کر سکی چاہے وہ آنے والی ذات کتنی ہی صاحبِ خیر وفضیلت رہی ہو۔

ہم جنسیت کے بغیر ہدایت مؤثر اور مکمل نہیں ہوسکتی چنانچہ تمام ہادی لباس بشریت میں آئے اور خیر محض ملک ''ہادی'' کا عہدہ نہ پا سکا۔ بے شک جناب آدمؑ سے شروع ہونے والی ہدایت اور نبوت کی تکمیل جناب خاتم الانبیاء پر ہوئی لیکن صنف نسواں کی مکمل اور مشرح ہدایت کے لیے ضرورت تھی کہ صنف نسواں کے مکمل نمونے بھی سامنے لائے جائیں جن کی زندگی کے آئینوں میں نسوانیت اپنے خدوخال کو مکمل طور پر درست کرسکے۔ چنانچہ جناب خدیجہؑ اور جناب فاطمہ زہراؑ، خاتم المرسلینؐ کی بیوی اور بیٹی بن کر دنیا میں تشریف لائیں۔ فاطمہ زہراؑ اپنے بلند درجہ کے باعث شریک کار نبوت قرار پائیں اور جناب خدیجہؑ غمگسار نبوت اور شریک کار ہدایت قرار پائیں۔ جب دنیا شمع نبوت کو گل کرنے کے لیے کوشاں تھی اس قت جو زندگی فانوس بن کر حفاظت کر رہی تھی اسی خدیجہؑ کی زندگی پر جناب مولانا سید کرار حسین صاحب قبلہ نے زیرنظر کتاب لکھی ہے۔خدا ان کو جزائے خیر دے اور آئندہ خدماتِ جلیلہ انجام دینے کی توفیق کرامت فرمائے اور اجراء خیر کے لیے ان کو محفوظ ومصئون رکھے اور مومنین کرام کثر ہم اللہ امثالھم کو زیادہ فائدہ اٹھانے کی توفیق دے۔

روزہ ایک راز

مومن کی محرومیاں کیوں؟

محرومی اور کامیابی کا چولی دامن کا ساتھ ہے دنیا میں کوئی شخص ایسا نہیں گذرا جس کو کامیابیاں ہی کامیابیاں ملی ہوں اور ایسا بھی کوئی شخص نہیں پایا گیا جس کو محرومیاں ہی محرومیاں ملی ہوں۔ بلکہ زندگی کی کھچڑی کامیابی اور محرومی سے مل کر پکتی رہی ہے۔

مذہبی نقطہ نظر سے انسانوں کی صرف دو قسمیں ہیں ایک وہ مومن جس کو خدا پسند کرتا ہے دوسرا وہ غیر مومن جس کو خدا ناپسند کرتا ہے۔ غیر مومن کی محرومیاں اس کے غلط عقائد۔ برے اعمال کا نتیجہ قرار دی جاسکتی ہیں لیکن مومن کی محرومیاں صاحبان ایمان کے ایمان میں کھٹک پیدا کرتی ہیں۔ اور اکثر کمزور ایمان والے بہک جاتے ہیں۔ ان کا ایمان شک وشبہ کا شکار ہوجاتا ہے۔ کھٹک کچھ کے دل میں رہ جاتی ہے۔ کچھ کی زبان پر آجاتی ہے۔ کچھ دبی زبان میں بات کرتے ہیں کچھ اظہار خیال میں بے ادب لب ولہجہ اختیار کرتے ہیں۔ ایسے تمام لوگوں کو مطمئن کرنے کے لیے مسئلہ کا مکمل جائزہ لینا ہوگا کیونکہ عرب، داب، ڈاٹ، ڈپٹ مسئلہ کو دبا سکتی ہے وقتی طور پر زبانوں کو خاموش کرسکتی ہے لیکن دلوں کو مطمئن نہیں کرسکتی۔

لیکن قبل اس کے کہ مسئلہ کی صورت حال کا جائزہ لیا جائے ایک بنیادی تذکرہ

ضروری ہے خداوند عالم نے اپنے کمزور بندوں پر جہاں ان گنت رحم فرمائے ہیں ان میں سے ایک اہم رحمت ''ایمان اجمالی'' ہے۔ یعنی مومن کو تفصیلات جاننے، سمجھنے، ماننے کا پابند نہیں کیا گیا ہے بلکہ خدا اور رسولؐ نے جو کچھ کہا ہے وہ درست ہے۔ خدا کا ہر کام صحیح ہے۔ شریعت کا ہر حکم مطابق عقل وفطرت ہے۔ یہ ایمان اجمالی انسان کو ہر نازک سے نازک موقع پر شک اور شبہ سے محفوظ رکھتا ہے۔ اس کے برخلاف ایمان تفصیل میں قدم رکھنا خطرناک ہے کیونکہ خداوند عالم کے کاموں کی وجہ کا سمجھنا مخلوق کے محدود علم کے بس کی بات نہیں ہے۔ وجہ سمجھنے کی ضد گمراہ اور کافر بنا دیتی ہے دنیا میں تجربہ کے بعد جس پر ہم بھروسہ کرتے ہیں پھر اس کے کاموں کی وجہ معلوم نہیں کرتے ہیں تو کیا وجہ ہے کہ عقل وتجربہ کی روشنی میں جب خدا کے عالم، عادل، حکیم ہونے کا یقین پیدا ہوچکا ہے تو ہم اس کے کاموں کی وجہ معلوم کرنے کے درپے ہوں۔ البتہ وجہ معلوم ہوجائے تو کیا کہنا اس سے ہمارے علم ویقین وایمان میں اضافہ ہوجائے گا اور اگر وجہ نہ معلوم ہوسکے تو ایمان اجمالی ہمارے سکون کا ذریعہ قرار پائے گا۔

اس ضمنی تذکرہ کے بعد آیئے اصل مسئلہ پر غور کریں۔

مومن کی محرومی پر غور کرتے وقت یہ الجھن پیدا ہوتی ہے کہ جب خدا اپنے بندہ سے خوش ہے اور اس کے خزانہ میں کوئی کمی نہیں ہے نہ وہ بخیل ہے تو پھر بندہ مومن زندگی میں بہت سی نعمتوں سے محروم کیوں رہتا ہے۔ بہت سے مصائب کیوں جھیلتا ہے۔ لوگوں کے طعنہ کیوں سنتا ہے۔ گھٹ گھٹ کر کیوں جیتا ہے اور یہ الجھن اس وقت اور بڑھ جاتی ہے جب کافر، نافرمان، سرکش، بدکردار افراد مومن کے مقابلہ میں عزت، دولت، صحت، کامیابی سے ہمکنار نظر آتے ہیں۔ لیکن اگر یہ معلوم ہوجائے کہ مومن کی محرومی اس کی

کامیابی کا زینہ ہے اور بدکردار کی کامیابی اس کی سزا میں اضافہ کا ذریعہ ہے تو یہ الجھن دور ہوجائے گی۔ظاہر ہے کہ بدکردار کو جتنی زیادہ کامیابی ملتی جائے گی وہ اسی قدر بدکرداری میں زیادتی کرتا جائے گا اور گناہوں کی زیادتی سزائیں اضافہ کا سبب بنے گی۔

البتہ مومن کی محرومی اس کی کامیابی کا زینہ ہے اس بات کے سمجھنے اور سمجھانے میں ضرورت دیر لگتی لیکن اس مشکل کو روزہ نے آسانی سے حل کردیا کیونکہ سخت ترین گرمی میں پانی ہوتے ہوئے پانی سے روزہ دار محروم رہتا ہے اور بے چین کردینے والی بھوک میں کھانے کے ہوتے ہوئے روزہ دار کھانے سے محروم رہتا ہے اور اس کی یہ محرومی اصلاح جسم کے ساتھ روحانی قوت میں اضافہ کرتی ہے اور آخرت میں بے شمار نعمات دلاتی ہے لہٰذا جس طرح روزہ دار کی محرومی اس کی کامیابی کا ذریعہ ہے اسی طرح ہر مومن کی ہر محرومی اس کی کامیابی کا زینہ ہے۔

جشن ولادت مجتبیٰؑ منانے کا فائدہ

کچھ بھی لکھنے سے پہلے یہ لکھنا ضروری سمجھتا ہوں کہ ہر کام کی افادیت کو برقرار رکھنے کے لیے ضروری ہوتا ہے کہ اسے رسم نہ بننے دیا جائے۔اسے رواج میں شامل نہ ہونے دیا جائے اسے فیشن بننے سے روکا جائے۔میری یادداشت میں ہندوستان میں سب سے پہلے ۱۳۶۱ھ واقعہ کربلا کی ۱۳سو سالہ یادگار منانے کا فیصلہ ہوا۔پورے ملک میں پورے جوش وخروش کے ساتھ یہ یادگار منائی گئی۔ہندوستان میں پائے جانے والے مختلف مذاہب کے ماننے والے اس میں شریک ہوئے۔ایک کام تھا جو ہوگیا اور اچھی طرح ہوگیا لیکن اس کے بعد ''حسین ڈے'' ایک رسم، ایک رواج، ایک مقابلہ، ایک مسابقت، ایک فیشن کی شکل میں شروع ہوا اور اس کا سلسلہ آج بھی جاری ہے آج واقعہ کربلا کے سلسلے میں جتنے اجتماع ہوتے ہیں سب سے زیادہ خرچیلا اجتماع ''حسین ڈے'' ہوتا ہے۔کیونکہ اس میں آنے والے فن کار ہوتے ہیں اور مشاعروں کے نرخ پر شرکت کرتے ہیں۔مہمان خصوصی وغیر خصوصی فائیو اسٹار ہوٹل میں ٹھہرتے ہیں۔رکشے کے بجائے کار مانگنی پڑتی ہے یا ٹیکسی کرنا پڑتی ہے۔شرکت کرنے والوں میں ایک آدھ اپنے ذاکر یا مقرر یا شاعر ہوتے ہیں جن سے معذرت کی جاسکتی ہے کہ کچھ خدمت ممکن نہیں ہے اللہ آپ کو اس صبر کی جزا دے گا۔باقی لوگوں کا تو پیمنٹ کرنا ہی پڑتا ہے۔یہ تو اس وقت ہے جب عالی قدر حضرات شرکت کرتے ہیں ورنہ شرکت کریں یا نہ کریں۔

مفکروں سے، نیتاؤں سے، اعلیٰ افسران سے وعدہ لینے کے لیے لکھنؤ دہلی وغیرہ کی بار بار یاترا تو کرنا ہی پڑتی ہے۔ اس دوڑ دھوپ میں کافی پیسے خرچ ہو ہی جاتے ہیں۔ پھر اشتہارات پر خرچ کرنا پڑتا ہے کیونکہ پبلسٹی نہ ہوئی تو آنے والوں کا بلانا بے سود ہو جائے گا اور حسینؑ ڈے کے بعد اگر خصوصی تعلقات نہ پیدا ہو سکے تو ساری محنت ضائع ہو جائے گی۔ غرض کہ حسینؑ ڈے سیاسی مفاد کے لیے ہو رہے ہیں۔ حد ہے کہ اجلاس میں وہ لوگ جن کا کردار بالکل حسینیت کے خلاف ہے تقریر کرتے ہیں۔ اگر ایک خدا کے نہ ماننے والے نے، ایک نبیؐ کے نہ ماننے والے نے ایک علیؑ کے نہ ماننے والے نے، ایک حسینی کردار کو نہ ماننے والے نے صرف یہ کہہ دیا کہ حسینؑ عظیم تھے بس حسینؑ ڈے عظیم ہو گیا۔ اگر کسی نے کہہ دیا کہ حسینؑ ہمارے ہیں بس ہم خوش ہو گئے چاہے حسینؑ سخت برہم ہوں کہ یہ شخص مجھے اپنا کیوں کہہ رہا ہے جبکہ اس کی زندگی میرے کردار و اقدار کا گلا گھونٹ رہی ہے لیکن ہم کو حسینؑ ڈے کی معنوی حیثیت کی فکر ہی کب ہے ہم کو صرف اس کی صوری حیثیت درکار ہے جو ہمارے نجی مقاصد کے لیے مفید ہو سکے ایک حسینؑ ڈے نہیں سیرۃ النبیؐ کے جتنے اجلاس سیاسی مقاصد کے لیے ہوتے ہیں ان کا بھی یہی حشر ہوتا ہے بلکہ چونکہ وہ بڑے پیمانے پر ہوتے ہیں تو ان کا نقصان بھی بڑا ہوتا ہے اور ان کے نام پر استحصال بھی بڑا ہوتا ہے۔ کاش اہل مذہب سوچتے کہ مکار سیاست کو مذہب کو نچوڑنے کا موقع نہ دیا جائے۔ مگر یہ تب ہی ممکن تھا جب اہل مذہب عقیدت کے بجائے عقیدے کے حامل ہوتے!!! اور اقرار دین کے ساتھ اس کے احکام پر عامل بھی ہوتے۔

غرض کہ سب سے پہلے واقعہ کربلا کی یادگار صدیوں کے حساب سے منائی گئی پھر یہ سلسلہ چل پڑا جشن بعثت ہوا، یادگار مرتضوی منائی گئی اور دوسرے معصومین علیہم

السلام کی یادگاریں منائی گئیں۔ میں ان یادگاروں کو مفید سمجھتا ہوں ضروری سمجھتا ہوں، ان کے انعقاد میں حصہ لیتا ہوں مگر اسی کے ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ یادگاروں کو ایک رسم، ایک رواج، ایک چلن، ایک روایت نہ قرار دیا جائے۔ بلکہ اس کے ساتھ کچھ بلند پایہ علمی کام ہوں اور اصلاحی و تعمیری و انقلابی اقدام کئے جائیں۔

مثلاً امام حسن علیہ السلام کے بارے میں جو لٹریچر فارسی، اردو میں موجود ہے یا کم از کم جو مواد صرف اردو میں موجود ہے چند اہل علم جن کو خدا نے علمی صلاحیت بھی دی ہے اور علمی کام کرنے کا وقت بھی دیا ہے جمع ہو کر اس لٹریچر کی تلخیص کریں اور ایک مجموعہ مرتب کریں تاکہ یادگار مجتبیٰؑ کی ایک علمی یادگار اردو داں حضرات کے ہاتھوں میں محفوظ ہو جائے۔ اسی کے ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ ذہنی تربیت کی ایک مہم چلائی جائے مثلاً ہماری قوم کی تباہی میں بلکہ اقوام عالم کی تباہی میں عہدے کی خواہش، منصب کی بھوک، اقتدار کے بھوت کا بہت بڑا ہاتھ کل بھی تھا اور آج بھی ہے، اگر اقتدار و عہدہ و منصب کے خلاف ایک علمی اور عملی مہم چلائی جائے تو ملک و قوم، دین و مذہب اور افراد اور اداروں کے لیے بے حد مفید ہوگا۔ امام حسن علیہ السلام کی زندگی کا یہ ایک نمایاں ترین رخ ہے کہ آپ نے حکومت، منصب، اقتدار، عہدے کو چھوڑ دیا تاکہ اسلام اور مسلمان انتشار سے محفوظ رہیں تاکہ دشمن صرف آپ سے دشمنی کر سکے۔ لیکن اسلام اس کی دشمنی سے محفوظ رہے، مسلمان کے خون اس دشمنِ جانی سے محفوظ رہیں۔

ذہن میں یہ سوال ابھر سکتا ہے کہ امامؑ کی زندگی میں ہر کمال موجود ہے اور قوم میں ہر طرح کی خرابی و بدعنوانی پائی جاتی ہے لہٰذا کیوں نہ مکمل تطہیر کی مہم چلائی جائے تو عرض ہے کہ بے شک دونوں باتیں درست ہیں لیکن بگڑے افراد، بگڑے کردار، بگڑی

معیشت ومعاشرت، بگڑے عادات واطوار ایک ساتھ درست نہیں ہوسکتے۔ جو لوگ سب کام ایک ساتھ کرنا چاہتے ہیں ان کے پاس صرف کاموں کی لسٹ رہتی ہے جو ہمیشہ بغیر کسی کمی کے جوں کی توں باقی رہتی ہے۔ سب کاموں کے چکر میں کوئی کام نہیں ہوتا ہے اس کے بجائے اگر صرف ایک ہی کام کے خلاف ایک سال تک مہم چلائی جائے۔ خوش خط، دیدہ زیب کتبے شائع کئے جائیں، نعرے لکھے جائیں، چرچے کو اتنا عام سے عام تر کیا جائے کہ ہر چھوٹے بڑے، عورت مرد، عالم جاہل کی زبان پر تذکرہ آجائے تو اگر وہ برائی ختم نہ ہوگی تو کم تو ہوگی۔ پروپیگنڈے کو جان دار بنانے کے لیے مثالی اقدامات کئے جائیں اور ان کو شہرت دی جائے تاکہ دوسروں میں ویسے اقدامات کرنے کا حوصلہ پیدا ہو تو نہ ہونے پر بھی بہت کچھ کام ہو جائے گا۔

آج ہمارے اوقاف، ہمارے ادارے، ہماری درس گاہیں، ہماری انجمنیں، ہمارے اعیان شخصیت پرستی ونسل پرستی کا شکار ہیں۔ جو ہے وہ ہٹنا نہیں چاہتا، جو نہیں ہے وہ بہر حال آنا چاہتا ہے۔ آنے والا سارا زور ہٹانے پر لگائے ہے اور رہنے والا سارا زور نہ ہٹنے پر لگائے ہے۔ اس زور آزمائی میں زر، زن، زمین سب سے کام لیا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ جو ہارتا ہے وہ تو ہارتا ہی ہے لیکن جو چت کرتا ہے وہ بھی تھک کر چت کرنے کے بعد خود چت ہو جاتا ہے مزید یہ کہ اقتدار کا کوئی نیا پجاری اپنا بت نصب کرنے کی فکر میں میدان میں آجاتا ہے، قوم محو تماشا رہتی ہے۔ مسائل حل کا منھ دیکھتے رہتے ہیں۔ اور مقاصد دم توڑتے رہتے ہیں۔ اگر ہمارے بنجر اوقاف، بنجر ادارے، بنجر درس گاہیں، بنجر انجمنیں پھر سے خدمت وخلوص کی آب یاری کے ذریعہ سرسبز ہو جائیں تو قوم کی کھیتیاں لہلہا اٹھیں۔ کیا ہم امام حسن علیہ السلام کی کامل واکمل سیرت سے اتنا سا جزئی وجزوی

فائدہ بھی نہیں اٹھا سکتے؟ اگر اتنا فائدہ بھی نہیں اٹھا سکتے تو پھر یادگار منانے کا فائدہ؟ امامؑ مسموم کی زندگی کے اس اہم کردار ساز رخ کی طرف سے رخ نہ موڑنے کی ضرورت ہے۔ لڑائی دل پسند مشغلہ ہے۔ آدمی کو آدمی سے لڑا کر جی خوش ہوتا ہے۔ چغل خوری کی لذت یہی لڑائی ہے۔ اگر اصلی لڑائی نہیں ہوسکتی تو مصنوعی لڑائی سہی کھیل کے نام پر، ورزش کے نام پر، مقابلے کے نام پر سہی اگر آدمی نہیں لڑتے تو جانور ہی لڑیں، بڑے جانور نہ سہی بٹیر ہی لڑ جائے۔ دیکھنے والے خوش ہیں، مست ہیں، مگن ہیں، قصے کہانیاں بھی اسی مصنوعی مار دھاڑ کے ذریعے دل پسند بنائی جاتی ہیں۔ صلح ہمیشہ عامی دل چسپی سے محروم رہی۔ بگڑے سماج کی یہ روش ہزاروں سال سے چلی آرہی ہے۔ پیغمبر کی جنگوں پر غیروں کو اعتراض ہوا کیوں کہ ان کو نقصان پہونچا تھا۔ لیکن آپ کی صلح پر وہ بھی چلا اٹھے جو اپنے کو پیغمبر کا پیرو کہتے تھے۔ صلح حدیبیہ کے موقع پر مسلمان جوش میں، غیظ میں، غضب میں بھرے بیٹھے ہیں، حضور کا ارشاد تک نہیں سنتے بال کٹانے یا منڈانے کے لیے بال برابر حرکت کرنے پر بھی تیار نہیں ہیں۔ بلکہ نافرمانی سے بڑھ کر توہین آمیز سوالات کا سلسلہ شروع کر دیتے ہیں۔ حضور کی نبوت پر نظر ثانی کی نوبت آجاتی ہے۔ نظر ثانی کرنے والے اس جسارت بے جا پر شرمند ہونے کے بجائے فخر محسوس کر رہے ہیں، نظر ثانی کا اعلان کر رہے ہیں۔ حضور رنجیدہ بیٹھے ہیں۔ مگر کسی کو رنجیدہ رسولؐ سے ہم دردی نہیں ہے۔ بلکہ سوالات کے کچوکے لگائے جا رہے ہیں۔ غرضکہ صلح حدیبیہ سے جہال وعوام کی برگشتگی کی ایک دستاویز ہے۔ اس ہنگامہ خیز واقعہ سے اندازہ ہوسکتا ہے کہ امام حسن علیہ السلام نے جب صلح کی ہوگی تو صورت حال کتنی قیامت خیز رہی ہوگی اندازہ لگانا ہو تو سوچئے امام حسن علیہ السلام کو مذل المومنین (مومنوں کو ذلیل کرنے والے) کا لقب

دیا جارہا ہے۔مگر امامؑ کی قوتِ برداشت میں کوئی فرق نہیں ہوتا۔آپ اس ذلیل لقب دینے والے کو سمجھاتے ہیں اور وہ مطمئن ہوکر چلا جاتا ہے۔امام حسنؑ کے پیش نظر ہے کہ صلح ہی پر نانا کی نبوت نظری ہوگئی تھی۔صلح صفین ہی نے کل ایمان پر فتویٰ کفر صادر کرایا تھا۔امام حسن علیہ السلام کو صلح کے بعد دشمن کی طرف سے کتنے زہریلے گھونٹ پینا پڑے۔ ان کو اگر نظر انداز بھی کر دیا جائے تو جو دوست کہلاتے تھے ان کی طرف سے کیسے کڑوے گھونٹ پینا پڑے۔اس کا اندازہ مندرجہ بالا واقعات اور حالات سے لگایا جاسکتا ہے مگر دین وقوم وملت وتاریخ وشریعت کو بچانے کے لیے امامؑ نے عہدہ چھوڑا، منصب چھوڑا، حکومت چھوڑی دولت چھوڑی حتیٰ کہ دوستوں کو چھوڑ دیا اور گوشہ نشینی کی مشقت وروح فرسا مذمت دردگردانی کا سامنا کیا مگر دنیا کو یہ راہ دکھائی کہ منصب ہدایت کرنا ہے منصب کردار سازی ہے، منصب افراد ومعاشرہ کو ہلاکت سے نکالنا ہے نہ کہ حکومت۔

اگر ہم اس سال صرف امامؑ کی زندگی کے اس رخ سے بھرپور فائدہ اٹھانے کی مہم میں لگ جائیں تو جشن چہاردہ صد سالہ ولادت مجتبیٰؑ کا مکمل فائدہ حاصل کرسکیں مگر کردار سازی کے لیے صرف گفتگار بے معنی ہے۔ضرورت ہے کہ کچھ دیوانوں کی جو اسیران ہوس کے برخلاف اپنے کو اسیرا امام حسن مجتبیٰؑ ثابت کریں۔

ہم اور آرزوئے حسینؑ

ہمارے اکثر خواب جھوٹے ہوتے ہیں۔لیکن انبیاء کے خواب سچے ہوتے ہیں۔خداوند عالم انبیاء اور ائمہؑ کو مختلف ذرائع سے پیغام بھیجتا ہے۔کسی کے پاس فرشتے جاتا ہے۔کسی کے پاس جناب جبرئیل ہی جاتے ہیں جو فرشتوں میں افضل ہیں۔کسی سے درخت کے ذریعہ باتیں ہوتی ہیں اور کسی سے کسی اور ذریعہ سے گفتگو ہوتی ہے۔وحی، الہام، القا، تحدیث کی طرح معصومونؑ کے خواب بھی الٰہی پیغام رسانی کا ایک ذریعہ ہوتے ہیں۔جناب ابراہیمؑ کا خواب مشہور ہے۔جناب یوسفؑ کا خواب بھی قرآن مجید میں بیان ہوا ہے اور یہ بھی بیان ہوا ہے کہ جناب یوسفؑ کو خدا نے خواب کی تعبیر کا علم دیا تھا۔جناب یوسفؑ کے واقعہ سے جہاں یہ معلوم ہوتا ہے کہ نبیؑ کا خواب سچا ہوتا ہے وہاں یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ جس کو خدا کی طرف سے تعبیر خواب کا علم دیا جاتا ہے اسی کو تعبیر خواب بیان کرنے کا حق ہے باقی ہم آپ یا تعبیر خواب کا علم دیا جاتا ہے اسی کو تعبیر خواب بیان کرنے کا حق ہے باقی ہم آپ یا تعبیر خواب کی جو کتابیں چھپی ملتی ہیں جن کی نہ کوئی سند ہے نہ بنیاد۔یہ سب تک بندیاں ہیں لگ گیا تو تیر نہیں تو تکا۔

امام حسین علیہ السلام اور واقعہ کربلا کے متعلق سچے خوابوں کا ایک سلسلہ کتابوں میں ملتا ہے۔میں یہاں پر ان میں سے چند خواب نقل کرنا چاہتا ہوں تاکہ نوجوان کے معلومات میں اضافہ ہو اور بزرگوں کی دوررس نگاہیں ان واقعات سے نئے نئے سبق

حاصل کریں اور معاشرہ کی تعمیر و اصلاح میں ان سے کام لیں۔ کیونکہ واقعہ کربلا کا مقصد اور فائدہ یہی ہے کہ افراد اور معاشرہ کی کرداری، اخلاقی، دینی اصلاح اور ترقی ہو۔ ہم حسینیوں کے پاس علم و عمل کے خزانے موجود ہیں جن پر ہماری غفلتوں اور ناواقفیتوں کی گرد جمی ہے۔ ہم ہیرے کو شیشہ سمجھ رہے ہیں اور غیر ان ہیروں سے فائدہ اٹھا رہے ہیں۔ میں ایک بے بضاعت اور کم علم آدمی ہوں لہٰذا حسب لیاقت واقعات اور اس کے نتائج کی طرف متوجہ کرنے کی کوشش کروں گا۔

پہلا خواب

مشکوٰۃ میں درج ہے کہ ام الفضل زوجہ جناب عباس عم رسول اللہؐ نے خواب دیکھا کہ آپ کی گود میں جسم پیغمبرؐ کا ایک ٹکڑا جسم مبارک سے جدا کر کے رکھ دیا گیا ہے۔ آپ یہ خواب دیکھ کر بہت پریشان ہوئیں اور حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہو کر آپ نے اپنا پریشان خواب بیان کیا حضورؐ نے فرمایا تمہارا خواب مبارک ہے۔ انشاء اللہ فاطمہؑ کا ایک بچہ پیدا ہوگا جس کی تم پرورش کرو گی۔ چنانچہ چند دن کے بعد امام حسینؑ پیدا ہوئے۔ جن کو میں نے دودھ پلایا۔ قثم ابن عباس اور امام حسینؑ رضاعی بھائی ہیں۔

(سبق اکثر خدائی امور کو ہم اپنے لیے برا سمجھتے ہیں جبکہ ان میں ہماری بھلائی ہوتی ہے)

دوسرا خواب

ناسخ التواریخ میں ہے کہ ہندزوجہ ابوسفیان نے جناب عائشہ کے پاس آکر اپنا

خواب بیان کیا کہ میرے سر پر ایک روشن آفتاب ظاہر ہوا۔ پھر اس آفتاب سے دوسرا آفتاب پیدا ہوا۔ پھر مجھ سے ایک کالا چاند پیدا ہوا اور اس کالے چاند سے دوسرا کالا چاند پیدا ہوا۔ اور دوسرا کالا چاند دوسرے روشن آفتاب کو نگل گیا۔ دنیا تاریک ہوگئی اور کالے ستارے آسمان پر پھیل گئے۔ حضورؐ نے خواب سن کر دو بار فرمایا اے دشمن خدا دور ہو جا۔ دور ہو جا۔ تو نے میرے غم میں اضافہ کر دیا۔ تو نے خواب نہیں سنایا ہے بلکہ میرے پیاروں کی سنانی سنائی ہے۔ پھر آپ نے تعبیر بیان فرمائی۔

پہلا آفتاب علیؑ ہیں دوسرا آفتاب حسینؑ ہیں، پہلا کالا چاند معاویہ ہے دوسرا کالا چاند یزید ہے۔ جو میرے فرزند حسینؑ کا قاتل ہے۔ اور شہادت حسینؑ کے بعد نبی امیہ کی حکومتیں رہیں گی جو کالے ستارے ہیں۔

(سبق: نبی کے پاس علم غیب ہوتا ہے اور تمام مخالفین علیؑ و اولاد علیؑ دشمن خدا و گمراہ ہیں اور گمراہی پھیلانے کا ذریعہ ہیں)

تیسرا خواب

اعثم کوفی، روضۃ الاحباب، حبیب السیر وغیرہ میں ہے کہ امیر المومنین علی علیہ السلام جب صفین کے لیے روانہ ہوئے تو بابل کی زمین سے گذر کر کربلا پہنچے جہاں فرات کے کنارے چند خرمے کے درخت تھے۔ ابن عباس سے پوچھا یہ کون زمین ہے۔ ابن عباس نے کہا مجھے نہیں معلوم۔ فرمایا اگر تم کو معلوم ہو جائے تو تم زار و قطار روؤ گے اس کے بعد حضرت امیرؑ خود اتنا روئے کہ ڈاڑھی تر ہوگئی۔ پھر امام حسینؑ کو بلا کر فرمایا آج تمہارا باپ اولاد ابوسفیان کے ہاتھوں شدید تکلیف اٹھا رہا ہے۔ کل تم ان کے ہاتھوں

زیادہ شدید تکلیف اٹھاؤ گے۔ صبر کرو بیٹا پھر آپ نے وضو فرمایا۔ چند رکعتیں نماز کی پڑھیں۔ اور تھوڑی دیر کے لیے آرام فرمایا۔

بیدار ہو کر ابن عباس کو بلایا۔ اور فرمایا میں نے عجیب خواب دیکھا ہے کہ کچھ روشن چہروں کے مالک لوگ تلواریں لگائے اور سفید علم لئے اترے اور انہوں نے اس سرزمین کے چاروں طرف خط کھینچا۔ اس وقت خرموں کے ان درختوں کی شاخیں زمین پر سر پٹک رہی تھیں اور ایک نہر ہے جس میں تازہ خون بھرا ہے اور میرا حسینؑ فریاد کر رہا ہے اور کوئی اس کی فریاد پر توجہ نہیں کرتا۔ پھر ان روشن چہرے والوں نے کہا کہ اے آل رسول اللہؐ صبر کرو۔ تمہارے قاتل بدترین مخلوقات ہیں۔ اور اے حسینؑ تم کو مبارک ہو کہ جنت تمہارے قدموں کی مشتاق ہو رہی ہے۔ سب روشن چہرے والے میرے پاس آئے اور تعزیت پیش کرنے لگے۔ پھر آنکھ کھل گئی۔

اے ابن عباس رسولؐ نے مجھے خبر دی تھی کہ میں اس زمین پر یہ خواب دیکھوں گا۔ یہاں اولاد فاطمہؑ دفن ہو گی۔ اہل آسمان اس زمین کو کربلا کہتے ہیں۔

اس کے بعد آپ نے زمین کربلا پر جناب عیسیٰؑ کا آنا مفصل طور پر بیان فرمایا اور اس قدر روئے کہ غش آ گیا۔ پھر بیدار ہو کر آٹھ رکعت نماز پڑھی۔ آپ امام حسینؑ کو بار بار صبر کی وصیت فرماتے تھے۔

(سبق: جناب امیرؑ بھی پیغمبرؐ کی طرح علم غیب کے مالک تھے اور حضورؐ نے آپ کو رتی رتی واقعات کی خبر دی تھی۔ آپ نے زمین کربلا میں واقعہ کربلا سے پہلے امام حسینؑ اور دوسروں کو واقعہ کربلا کی خبر دی اور واقعہ کے شروع اور آخر میں آپ کا نماز پڑھنا اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ واقعہ کربلا کا تذکرہ کرنے والوں کا فرض ہے کہ پابند صوم

وصلوٰۃ ہوں اور پابند دین ہوں)

چوتھا خواب

تاریخ محمد ابن ابی طالب میں ہے کہ امام حسین علیہ السلام مدینہ سے چلنے سے پہلے بار بار قبر پیغمبر پر گئے۔ ایک بار قبر پر سو گئے اور خواب میں حضور کو دیکھا۔ حضورؐ نے امام پر سلام فرمایا اور فرمایا تمہارے باپ بھائی میرے پاس آ چکے اب ہم تمہارے مشتاق ہیں۔ بیٹا جلدی آؤ۔ ہمارے ساتھ جنت میں تمہاری بھی ایک جگہ ہے۔ جس تک تم بغیر شہادت نہیں پہنچو گے۔ آؤ بیٹا جلدی آؤ۔

(سبق خدا نے جنت کے سردار کے لیے یہ راستہ کہ شہادت سے گذر کر جنگ میں تشریف لائیں اسی لیے معین فرمایا ہے کہ ہم اس بات کا یقین کر لیں کہ بغیر عمل کوئی مومن جنت میں جانے کا خیال نہ کرے۔)

پانچواں خواب

تاریخ خمیس اور اسد الغابہ میں ہے کہ جناب عبداللہ ابن جعفر نے جب امام حسین علیہ السلام کو سفر سے روکنے پر اصرار کیا تو آپ نے فرمایا کہ خواب میں نانا نے مجھے ایک حکم دیا۔ جس کی تعمیل کے لیے مجھے یہ سفر کرنا ضروری ہے۔

مقتل ابی مخنف میں ہے کہ جب جناب محمد حنفیہ نے آپ کو مدینہ سے روانگی کے وقت روکا تو آپ نے فرمایا کہ خواب میں نانا نے مجھ کو سینہ سے لگایا۔ میری پیشانی چومی اور فرمایا بیٹا عراق کا سفر کرو۔ کیونکہ الٰہی فیصلہ یہی ہے کہ تم کو تمہارے خون میں لتھڑا

ہوا اور شہید دیکھے۔ یہ سنتے ہی محمد حنفیہ تڑپ کر روئے اور مہار ناقہ چھوڑ دی اور عرض کی حضور تشریف لے جائیں مگر عورتوں کو کیوں ساتھ لے جارہے ہیں۔ فرمایا خدا ان کو بھی اپنی راہ میں سخت قید و مشقت کی حالت میں دیکھنا چاہتا ہے۔ محمد حنفیہ روئے اور امامؑ کو رخصت کر دیا۔

چھٹا خواب

قصر بنی تعاتل سے روانہ ہو کر راستہ میں امام حسینؑ نے جناب علی اکبرؑ سے اپنا خواب بیان فرمایا کہ بیٹا میں نے ایک خواب دیکھا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ اب ہمارا وقت شہادت قریب ہے۔ جناب علی اکبرؑ نے کہا جب ہم حق پر ہیں تو ہم شوق سے راہ خدا میں جان دیں گے۔ امامؑ نے اپنے فرزند کو دعا دیتے ہوئے فرمایا خدا نے بیٹوں کو ان باپ کی طرف سے جو جزائیں دی ہوں ان جزاؤں میں سب سے بہتر جزا خدا تم کو دے۔

آخری خواب

جب ۹ رمحرم کو پسر سعد نے فوج کو حملہ کا حکم دیا تو فوج خیموں کی طرف بڑھ رہی تھی اور امامؑ جناب زینبؑ سے فرمارہے تھے کہ میں نے ابھی ابھی خواب دیکھا ہے کہ نانا میرے مشتاق ہیں۔ جناب زینبؑ بے قرار ہو کر رو رہی تھیں۔ آپ نے صبر کی وصیت کرتے ہوئے آخری فقرہ فرمایا کہ اے بہن صبر کرو تا کہ دشمن میری شماتت نہ کر سکے اور میرا مذاق نہ اڑا سکے۔

امامؑ اپنی بہن کو جانتے تھے کہ ان کا کوئی کام دشمن کو ہنسنے کا موقع نہیں دے سکتا لیکن شاید امامؑ اپنی ترجمان کے ذریعہ اپنے غلاموں عزاداروں، شیعوں کو پیغام دے رہے تھے کہ ایسے کام نہ کرنا کہ تمہاری وجہ سے دشمن ہمارا مذاق اڑا سکے۔

اے کاش ہم اپنے امامؑ کی آرزو پوری کرتے۔

علم وتعزیہ شعائرالٰہی
اور قابل تعظیم وواجب الاحترام ہیں

مسلمانوں میں ایک طبقہ ایسا ضرور پایا جاتا ہے۔ جو غیر خدا کی تعظیم کو ناجائز جانتا ہے لیکن جو مسلمان بھی قرآن مجید پر ایمان رکھتا ہے اس کے لیے قرآن مجید کے صریحی احکام کی مخالفت کرنا درحقیقت قرآن مجید کو جھٹلانا ہے اور قرآن مجید پر سے ایمان اٹھانا ہے۔ اور بیان قرآن مجید کو جھٹلانا کسی مسلمان کے لیے ممکن نہیں ہے۔ اگر وہ مسلمان رہنا چاہتا ہے اور اپنے کو دوزخ کی آگ سے بچانا چاہتا ہے اور جنت میں جانا چاہتا ہے۔ قرآن مجید کی چند صراحتیں اس سلسلہ میں درج کی جاتی ہیں۔ مگر صرف آیتوں کا حوالہ دیا جارہا ہے اور ترجمہ درج کیا جارہا ہے کیونکہ آج کل عام کاتبوں کے لیے صحیح عربی لکھنا اور قارئین اخبار کا عموماً آیات قرآنی کی حرمت وتعظیم کا قائم رکھنا مشکل دکھائی دیتا ہے۔ اکثر اخباروں میں چھپنے والی آیات کی بے حرمتی ہوتی ہے جس کا احساس بھی نہیں کیا جاتا۔

واضح ہو ترجمہ مولانا فرمان علی صاحب قبلہ اعلیٰ اللہ مقامہ کا پیش کیا جارہا ہے۔

(۱) سورہ حج کی آیت ۲۹/ میں ارشاد ہے کہ:

''جو شخص خدا کی حرمت والی چیزوں کی تعظیم کرے گا تو یہ اس کے پروردگار کے یہاں اس کے حق میں بہتر ہے۔''

قرآن مجید کی اس تصریح کے بعد حرمت اللہ (خدا کی حرمت والی چیزوں) کی تعظیم نہ صرف جائز ہے بلکہ ممدوح وباعث ثواب وعبادت ہے۔

(۲) اسی سورہ حج کی آیت ۳۱/ میں ارشاد ہوتا ہے۔

''اور جس شخص نے خدا کی نشانیوں کی تعظیم کی تو کچھ شک نہیں کہ یہ بھی دلوں کی پرہیزگاری سے حاصل ہوتی ہے۔''

قرآن مجید کی اس تصریح سے واضح ہے کہ شعائراللہ (خدا کی نشانیوں) کی تعظیم تقویٰ حقیقی وتقویٰ قلبی ہے۔

(۳) اسی سورہ حج کی آیت ۳۵/ میں ارشاد ہوتا ہے۔

''اور قربانی کے (موٹے۔ گدبدے) اونٹ بھی ہم نے تمہارے واسطے خدا کی نشانیوں میں سے قرار دیا ہے۔ اس میں تمہاری بہت سی بھلائیاں ہیں۔''

قرآن مجید کی اس تصریح کی روشنی میں وہ جانور بھی قابل تعظیم ہیں جو حج میں قربان کئے جاتے ہیں۔

(۴) سورہ مائدہ کی آیت ۳/ میں ارشاد ہے۔

''اے ایماندارو! (دیکھو) نہ خدا کی نشانیوں کی بے توقیری کرو اور نہ حرمت والے مہینے کی اور نہ قربانی کی نہ پٹے والے جانوروں کی (جو نذر خدا کے لیے نشان دے کر منیٰ میں لے جائے جاتے ہیں) اور نہ خانۂ کعبہ (کی طواف وزیارت) کا قصد کرنے والوں کی جو اپنے پروردگار کی خوشنودی اور فضل (وکرم) کے جویان ہیں۔''

اس آیت کے سلسلہ میں جناب مولانا فرمان علی صاحب قبلہ اعلیٰ اللہ مقامہ نے

حاشیہ پر نوٹ لکھا ہے کہ:

’’حطم بن منذر کندی نے حضرت رسولؐ کی خدمت میں حاضر ہوکر عرض کی آپ کس بات کی دعوت دیتے ہیں۔آپ نے فرمایا کہ خدا کی توحید کی، اپنی نبوت، نماز، زکوٰۃ کی، وہ بولا میں مشورہ کرلوں تو عرض کرو۔غرض وہ چلا آیا، اور ایمان نہ لایا۔طرفہ یہ کہ چلتے چلاتے کچھ صدقے کے اونٹ بھی لوٹتا گیا۔ دوسرے سال حضرت عمرہ کے واسطے مکہ کو چلے۔جب وادی نعیم میں پہنچے تو معلوم ہوا کہ حطم کندی انہیں اونٹوں کی گردنوں میں سنہرے پٹے ڈال کر خانہ کعبہ کو چلا ہے۔اصحاب نے چاہا کہ اس کو قتل کر کے اونٹوں کو چھین لیں، آپ نے منع کیا اصحاب نے عرض کی ہم ایام جاہلیت میں ایسا اکثر کیا کرتے تھے تب یہ آیت نازل ہوئی۔

قرآن مجید کی مندرجہ بالا تصریح اور روایت میں مندرج تشریح سے واضح ہے کہ شعائر خدا کی تعظیم نہ کرنا جاہلیت ہے۔اسلام نہیں ہے۔اور شعائر خدا میں وہ مہینے بھی شامل ہیں جن میں جنگ حرام ہے۔اور قربانی کے جانوروں کے ساتھ ان کی گردنوں میں پڑے ہوئے پٹے بھی شعائر خدا ہیں اور حج وعمرہ کرنے والے افراد بھی شعائر خدا میں ہیں اور ان سب کی تعظیم حقیقی پرہیزگاری ہے۔اور ان کی تعظیم نہ کرنا زمانہ کفر کی جاہلیت ہے۔

(۵) سورہ بقرہ کی آیت ۱۵۸/ میں ارشاد ہوتا ہے۔

’’بے شک (کوہ) صفا اور (کوہ) مروہ خدا کی نشانیوں میں سے ہیں۔پس جو شخص خانۂ کعبہ کا حج یا عمرہ کرے اس پر ان دونوں کے (درمیان) طواف (آمدورفت)

کرتے ہیں کچھ گناہ نہیں (بلکہ ثواب ہے)

مولانا نے حاشیہ پر لکھا ہے۔

’’صفا اور مروہ مکہ میں دو پہاڑیاں ہیں۔جب حضرت ابراہیمؑ نے حضرت ہاجرہ اور حضرت اسماعیلؑ کو وہاں لا بٹھایا تھا۔اور حضرت ہاجرہ اپنے بیٹے کی پیاس سے بے چین ہوکر کئی مرتبہ انہیں دونوں پہاڑیوں کے درمیان دوڑی تھیں۔اسی کی یادگار میں یہ ارکان حج سے قرار دیا گیا مگر قبل عروج اسلام چونکہ یہاں بت رکھے ہوئے تھے اس وجہ سے بعض مسلمانوں کو یہ خیال پیدا ہوا کہ شاید انہیں کی وجہ سے ہے اور کچھ جھجھکنے لگے اس وجہ سے خدا نے یہ آیت نازل کی۔

مدرجہ بالا تصریح قرآن مجید سے واضح ہے کہ پہاڑیاں بھی قابل تعظیم ہیں اور ان کے درمیان دوڑنا حج وعمرہ میں ضروری ہے کیونکہ جناب ہاجرہ ذبیح اللہ ہیں اور جناب امام حسین علیہ السلام ذبح عظیم ہیں جس کا ذکر قرآن مجید میں ہے اور جس کی صراحت تفسیر وحدیث میں ہے۔

لہٰذا امام حسین علیہ السلام کی عزاداری اور مراسم عزا بدرجہ اولیٰ شعائر اللہ میں داخل وشامل ہیں۔اور قابل تعظیم ہیں اور جس مسلمان کو قرآن مجید پر ایمان بحال رکھنا ہے اور اپنے کو قبر سے محشر تک عذاب الٰہی سے محفوظ رکھنا ہے۔اس کو عزاداری سے متعلق امور خصوصاً علم وتعزیہ وغیرہ کو قابل تعظیم ماننا ہوگا۔ہم خدا کا شکر ادا کرتے ہیں کہ اس نے ہم کو اپنے دین (دین اہلبیت علیہم السلام) پر ایمان لانے کی توفیق دی اور ہماری خدا کی بارگاہ میں التجا ہے کہ وہ ہم کو اس دین پر مرتے دم تک ثابت قدم رکھے اور ہمارے ایمان وعمل کو شرف قبولیت بخشے۔

زمانہ برسرِ جنگ است

سرکار خطیب اعظم طاب ثراہ کا یہ وہ مضمون ہے جو الواعظ کے حجۃ العصر نمبر کے صفحہ ۴۶، اپریل و مئی ۸۵ء کے مشترکہ شمارہ میں شائع ہوا تھا۔ جس میں سرکار خطیب اعظم طاب ثراہ نے مولانا عبدالعلی صاحب فاروقی کی کوشش تبیس کے تار و بود کو بقلم خود بکھیر دیا ہے اور اپنے سیاسی حریفوں اور یاوہ گویوں کو لاجواب کر دیا ہے ہم اس قیمتی مقالہ کو سرکار خطیب اعظم کی اصل تحریر سے شائع کر رہے ہیں جس میں چند پیراگراف زیادہ ہیں کیوں کہ محترم مدیر الواعظ نے اپنی کسی مصلحت کے پیش نظر ان کو اصل مضمون سے حذف کر دیا تھا۔

(ادارہ)

پردادا جب مرے تھے تو کفن چندہ سے ہوا تھا، دادی کے یہاں جب پہلا بچہ ہوا تو وہ سور (زچہ خانہ) میں فاقہ سے تھیں۔ یہ بچہ اپنی بھوکی ماں کا دودھ پی کر پلا تھا۔ بھوکی ماں کا دودھ پینے والا زندگی بھر بھوکا رہا کبھی پیٹ بھر کر کھانا نہیں ملا۔ ملتا بھی کیسے خود بھی غریب تھا بیوی بھی غریب گھرانے کی تھی۔ پیوند میں پیوند ہی اسی لیے لگا تھا کہ غربت کی بنا پر نہ اس غریب لڑکے کو لڑکی مل رہی تھی اور نہ اس غریب لڑکی کو لڑکا مل رہا تھا جب دونوں غریب خاندان ملے تو انہوں نے لپک کر نسبت طے کر لی بھوکے کو کیا

چاہئے دو روٹیاں وہ تو نہ مل سکیں اندھے کو کیا چاہئے دو آنکھیں یہ بھی نہ مل سکیں لیکن دو غریب خاندانوں میں غربت کی بنیاد پر شادی ہوگئی آج بھی نالے کے کنارے یہ غریب خاندان روشن دان والی چھت کے نیچے جھونپڑے میں زندگی گذار رہا ہے اور کچھ نئی غربتیں لڑکی لڑکوں کی شکل میں جوان ہو رہی ہیں۔ یہ چار نسلیں غربت کا شکار تھیں اور ہیں غربت نے جسمانی نقص بھی پیدا کر دیئے غربت نے تعلیم سے دور رکھا اخلاق بھی خراب ہو گئے۔ گالیوں سے صبح ہوتی تھی اور لڑائی پر شام ہوتی تھی اور لڑتے لڑتے سو جاتے تھے کیونکہ نیند کو سولی نہیں روک سکتی ہے تو غربت، بھوک، دھوپ، غصہ، لڑائی کیا روک سکے گی؟ لیکن اس خاندان میں چار پشتوں سے غربت ہی سوتی ہے اور غربت ہی جاگتی ہے۔ لباس کے بجائے چیتھڑوں کی شکل میں غربت ہی لٹکتی رہی ہے غربت نے منھ دھونے، اور نہانے سے بھی آزادی دلا دی ہے۔ غربت کے باعث دوا کی بھی ضرورت نہیں رہی نزلہ کا علاج کھانسی سے اور کھانسی کا علاج سل اور ٹی بی یا دمہ سے ہو جاتا تھا بھوک کا علاج خون کی کمی سے سڑے کھانے سے پیدا ہونے والی بدہضمی کا علاج ہیضہ سے ہو جاتا تھا۔ یہ خاندان طاعون کے ختم ہونے پر کف افسوس ملتا ہے کیونکہ طاعون ان کے خیال میں رحم دل بیماری تھی۔ خاندان کے خاندان صاف کر دیتی تھی۔ رگڑ رگڑ کر مرنا نہیں پڑتا تھا۔ غربت نے اس خاندان کے لیے موت کو غیر معمولی منفعت بخش بنا دیا تھا۔ پہلا فائدہ یہ کہ مرنے والا بھوک اور دوسری تکلیفوں سے آزاد ہو گیا دوسرا فائدہ یہ کہ کفن کے چندے سے کچھ بچ رہا بلکہ بچانے کی کوشش میں کافی کامیابی رہی۔ تیسرا فائدہ یہ کہ خیرات کے ذریعہ گناہوں کو دھونے والے کالے کرتوت کرنے والے مخیرّ حضرات ایسے موقع پر دو چار دن کھانا بھیج دیتے ہیں۔ اس غربت زدہ

اور افلاس کے مارے خاندان کی تمنا ہے کہ روز کوئی ان کے گھر مرتا رہے۔ تاکہ فٹ پاتھ پر لاش لٹا کر چندہ کشی ہو سکے مگر موت بھی اتنی مہربان نہیں ہے کہ روز آئے۔ پھر یہ سوال بھی ہے کہ روز آئے تو اسے روز ایک مرنے والے کی ضرورت ہوگی۔ جبکہ خاندان میں چھوٹے بڑے ملا کر بھی دس نہیں ہیں۔ لہٰذا موت بھی کوٹہ دیکھ کر راشننگ کے اصولوں پر آتی ہے۔ بہ ظاہر یہ ایک فرضی داستان ہے لیکن درحقیقت لاکھوں خاندان کی بپتی ہے۔ بلکہ جب سے دنیا قائم ہے ایسے اربوں خاندانوں نے ایسی ہی بلکہ اس سے بھی بدتر زندگی گزاری ہے لیکن کیا اس نسلی وخاندانی اور صدیوں بلکہ ہزاروں سال پرانی غربت و بیماری و بدحالی و بدکرداری و بداخلاقی کو اس لیے صحیح قرار دیا جاسکتا ہے کہ یہ ہزاروں سال سے ہے اور اربوں خاندانوں میں ہے۔ نہیں اور ہرگز نہیں۔ بلکہ سب کو راحت چاہئے سب کو آرام چاہئے۔ مکان، غذا، لباس، دوا، عزت، توانائی غرض سب کچھ چاہئے اور دل جو دردمند ہے وہ کر سکے یا نہ کر سکے مگر یہی چاہے گا کہ زمانہ میں راحت وعدل وسکون کا دور دورہ اور رواج ہو جائے۔ تاکہ نہ کوئی دکھ دے نہ کوئی دکھ جھیلے۔ آنسو کے نالے بند ہو جائیں، اور مسکراہٹوں کی بارش رم جھم رم جھم برستی رہے۔ آہوں کا دھواں اٹھنا بند ہو جائے، سرد آہیں دنیا سے ناپید ہو جائیں۔ خوف کا خاتمہ ہو جائے صرف خوف خدا باقی رہے۔ صرف توبہ کے آنسو باقی رہیں۔ صرف گناہوں کے صدمہ پر آہیں بھری جائیں صرف شوق جنت کے لیے بے قراری باقی رہے۔ دنیا اور اس کی نعمتیں گناہوں میں بے قیمت اور ہیچ ہو جائیں۔ کمزوروں کا محور ومرکز صرف آخرت اور خوشنودی خدا و نبیؐ ومعصومین علیہم السلام ہو۔

غرض کہ ظلم اور تکلیف کا خاتمہ اور عدل وسکون کا رواج ہر شخص چاہتا ہے چاہے

وہ ملحد ومنکر خدا و مذہب کیوں نہ ہو۔ اور ہر مذہب کا ماننے والا چاہے عیسائی ہو، یہودی ہو، مجوسی ہو، یا کسی مذہب کا ماننے والا ہو اس کو اس کے مذہب نے دنیا کے آخری انجام قیامت سے پہلے ظلم وتکلیف کے اختتام کا اور عدل وراحت وسکون کے عالمی رواج اور چلن کا تصور دیا ہے۔ ملحد کے پاس انجانا تصور ہے اہل مذاہب کے پاس جانا بوجھا تصور۔ مگر خاکہ ہے جس میں رنگ نہیں ہے، خواب ہے جس کی تعبیر نہیں ہے، آرزو ہے جس کی معین تصویر نہیں ہے۔ تھیوری اور فارمولا اور اصول ہے مگر پریکٹکل اور عملی صورت میں اس خواب کو کون پورا کرے گا اس کا نام خاندان پتہ اور نشان نہیں معلوم ہے۔ یہ فخر صرف اسلام کو حقیقی دین مبین اہلبیتؑ کو حاصل ہے کہ اس نے تصور مہدیؑ کے ذریعہ ظلم وتکلیف کے خاتمہ اور عدل وسکون کے رواج کا مکمل تصور پیش کیا ہے۔ اور حضرت مہدیؑ سے متعلق تمام ذاتی خاندانی حالات ولادت وغیبت صغریٰ، غیبت کبریٰ قبل ظہور، وقت ظہور کے واقعات، طرز انقلاب، طریقہ حکومت حق وباطل کی آخری کش مکش کی مکمل تفصیل اور فتح حق کی پوری تاریخ بیان کردی ہے صاحبان علم سے درخواست ہے کہ آقائی محمد صدر جن کا خاندان شہید خامس آقائی باقر صدرؒ کا خاندان ہے کہ تین تصنیفوں کا مطالعہ ضرور کریں۔ جس میں غیبت صغریٰ، غیبت کبریٰ اور بعد ظہور کی تاریخ کی تفصیل کو بڑے سلیقہ سے جمع کیا ہے روایات کی چھان بین بھی کی ہے واقعات کے ذریعہ ماحول کی تشخیص بھی کی ہے۔ غیب وظہور کے پس منظر کو فلسفۂ تاریخ کی روشنی میں پیش کیا ہے اور ظہور کے دلکش، دلفریب منظر کو بھی پیش کیا ہے۔ میں مدیر محترم الواعظ کی خدمت میں گذارش کروں گا کہ اگلے تین سال تک ان تینوں کتابوں کا ترجمہ تلخیص پیش کریں تاکہ اردوداں بھی ان خزانوں اور جواہر پاروں سے مستفید ہو جائیں اور تین سال مضمون کے چندہ کی

زحمت سے بھی نجات مل جائے گی۔اور کم محنت میں زیادہ مفید کام ہو سکے گا۔

غرض کہ انسانی مشکلات کا حل ہر انسان کی آرزو ہے بلکہ اس آرزو کو عالمی آرزو قرار دیا جا سکتا ہے اور اس عالمی آرزو کا حصول بغیر عالمی حکومت کے قیام کے ناممکن ہے جب تک ملکوں کا وجود ہے ملکی قوانین کے ذریعہ علاقائی تعصب وتنگ نظری کو قوم پرستی قرار دے کر تصادم کی نت نئی راہیں پیدا ہوتی رہیں گی جب تک لسانی، نسلی، تہذیبی، تمدنی، صنعتی، تجارتی، معاشی، معاشرتی، سیاسی، طبقات باقی رہیں گے تب تک طبقاتی کش مکش انسانیت کو آٹھ آٹھ آنسو رلاتی رہے گی۔ دنیا کا حال زار یہی رہے گا کہ انسانیت روتی رہے گی اور طبقاتیت مسکراتی رہے گی۔غرض کہ جب تک افراد کی اکائیاں، خاندان کی دہائیاں طبقات کے سیکڑے، ملکوں کے ہزارے باقی رہیں گے ہر تعمیر ہر قدم پر ایک نہیں بے شمار تخریبیں پیدا کرتی رہے گی۔ اگر کش مکش کو ختم کرنا ہے تو قطروں کو سمندر میں جمع ہونا پڑے گا تا کہ لہریں سب کی ہوں، موجیں سب کی ہوں، سمندر موجزن رہے گا اور ہر قطرہ موج میں رہے گا۔مگر انسانی قطروں کا سمندر میں جمع ہونا ناممکن ہے۔ جب تک سب فاصلے ساری جدائیاں تمام امتیازات ''عبدیت رب العالمین'' کے ذریعہ مٹ نہ جائیں ہم سب خدا کے بندے ہیں یہی ہمارا آغاز ہو یہی ہماری زندگی ہو، یہی ہماری رفتار وگفتار ہو، یہی ہمارا انجام ہو۔ یہی میراث اپنے بعد کی نسلوں کو دیں۔ بندگی رب العالمین ہی وہ بنیاد ہے جس کے ذریعہ عالمی ذہن کی پیداوار ممکن ہے۔ عالمی ذہن کی تربیت کے لیے عالمی مذاہب سلام کے نفاذ کی ضرورت ہے، عالمی مذہب کے نفاذ کے لیے عالمی حکومت کی ضرورت ہے۔ مہدیؑ....عالمی حکومت کے سربراہ کا نام ہے جس کے ذریعہ عالمی کرداری انقلاب آئے گا۔اور بعد ظہور زندگی کا ہر قطرہ عدل کے سمندر

میں مسرور وپرسکون آئے گا اور بعد ظہور زندگی کا ہر قطرہ عدل کے سمندر میں مسرور وپرسکون زندگی بسر کر سکے گا۔ جب عالمی ذہن عالمی مذہب اور عالمی حکومت تمام عالمی مشکلات کا حل ہے تو منزل طے ہو جانے کے بعد منزل کی طرف ہمارا سفر شروع ہو جانا ضروری ہے۔تا کہ ہم خود اپنی جانچ کر سکیں کہ ہمارا عقیدہ صرف تصوراتی نہ ہو بلکہ ہمارا عمل اس کی تصدیق کر رہا ہو تمام مومنین عالمی آرزو یعنی ''ظہور مہدیؑ'' کی طرف سفر شروع کر چکے ہیں۔ ہر ملک میں یہ سفر شروع ہو چکا ہے، ویران مسجدیں آباد ہو گئی ہیں، زمین مدرسوں سے آباد ہوتی جا رہی ہے۔محراب ومنبر سے بیان دین جاری ہے۔مسائل جاننے کا شوق پیدا ہو چکا ہے۔ دیندار بننے کا ذوق ترقی کر رہا ہے۔مگر روشنی کے بالمقابل ابھی اندھیرا زیادہ ہے جس کی ایک بڑی وجہ یہ ہے کہ اہل علم کے بھیس میں علم دشمن افراد تباہی مچائے ہوئے ہیں۔ برصغیر ہند وپاک وبنگلا دیش میں ضرورت ہے کہ ایک پیرو خمینی کی جوان مسلم دشمن افراد کے لباس اتروا دے۔خلع لباس کی خمینی مہم کو دہرا دے۔ دین بیچ ڈالنے والوں کی ملاقات سے انکار کر دے۔ آج ہر جھوٹ قابل مذہب ہے مگر جو مجتہد نہیں ہیں ان کو مجتہد العصر والزمان کہنا، لکھنا، چھاپنا جھوٹ نہیں ہے۔ بلکہ ان پر انگلی اٹھانے والوں کی زندگی قلم کر دی جائے گی۔ غیبت، جھوٹ، الزام تراشی، فتنہ گری، مفسدانہ باتیں، سب قابل مذہب ہیں۔لیکن یہ برائیاں اگر نااہلوں کے ذریعہ منبر سے ہوں تو انکو سننا اور سنانا توہین شریعت نہیں ہے۔ بلکہ خدمت دین ہے جب تک راستہ کے یہ پتھر باقی رہیں گے حضرت مہدیؑ کی طرف جانے والے قافلہ میں اس طرح انتشار پیدا ہوتا رہے گا جس طرح راستہ طے کرنا ہوتا ہے قافلہ کی صورت بگڑ جاتی ہے اور ایک سمت جانے والے مختلف سمتوں میں چلتے دکھائی دیتے ہیں۔ رہبر انقلاب اسلامی آقائی خمینی

مدظلہ العالی نے لباس اتروانے (خلع لباس) کی مہم ایجاد نہیں کی بلکہ اس حدیث کی عملی تشریح کی کہ حضرت حجتؑ کو ظہور کے بعد سب سے پہلے برے علماء (علماء سو) کا مقابلہ کرنا ہوگا سب کو تہہ تیغ کرنا ہوگا کہ راستہ کا پتھر ہٹ جائیں اور امامؑ کے اطاعت گزار قدم سے قدم ملا کر چل سکیں اگر ظہور سے پہلے ہمارے درمیان کوئی کرداری انقلاب نہیں آتا ہے تو بھی ہم کو اوصاف اور خصلتوں و عادتوں کے ذریعہ بول چال، رہن سہن کے ذریعہ یہ تمیز پیدا کرنا چاہئے کہ کون باعمل متقی پرہیزگار، پاکیزہ دل، پاکیزہ کردار صاحبان علم ہیں اور کون نہیں۔ اور تمیز کو فقط دل کے نہاں خانوں میں نہیں رکھنا چاہئے بلکہ عمل کے میدانوں میں ظاہر کرنا چاہئے۔ آج اتحاد بین المسلمین کی دھجیاں بھی اڑائی جارہی ہیں اور اتحاد بین المومنین بھی پارہ پارہ کیا جارہا ہے عزاداروں میں پھوٹ ڈالنے کی کوشش جاری ہے عزاداری کے مخالفوں اور دشمنوں کی مدد کی جارہی ہے تاکہ صف عزا انتشار کا شکار ہوسکے۔ مگر پھونکوں سے یہ چراغ نہیں بجھے گا۔

لکھنؤ جہاں عزاداری بند کرانے کی کوشش کا منحوس سلسلہ ابھی جاری ہے۔ کاکوری اسی لکھنؤ سے قریب ہے۔ وہی کاکوری جہاں سے عبدالشکور صاحب نکلے تھے جنھوں نے پاٹا نالہ لکھنؤ کو اپنا گڑھ بنایا تھا آج اسی کاکوری سے عبدالعلی فاروقی صاحب نے دین اہلبیت علیہم السلام کی مخالفت میں ایک کتاب لکھی ہے اگلے جو زہر اگلتے رہے ہیں پچھلے نے بھی وہی کیا ہے انھوں نے اپنی کتاب میں عزاداروں میں پھوٹ ڈالنے کی مکروہ اور جھوٹی کوشش کرتے ہوئے ۸۲ء کے الواعظ کے محرم نمبر کے میرے مضمون کو جو عزاداری کی حمایت اور رسموں کی مخالفت میں ہے۔ اس کو عزاداری کا مخالف لکھا ہے۔ عبدالعلی فاروقی کاکوروی عزاداری کو صرف ''رسم'' سمجھتے ہیں مگر ان کو

چاہئے کہ شاہ عبدالعزیز دہلوی کی سرالشہادتین پڑھیں۔ شاہ سلامت اللہ کا کیا ہوا ترجمہ سرالشہادتین پڑھیں، شیخ عبدالقادر جیلانی کی غنیۃ الطالبین پڑھیں۔ علامہ جلال الدین سیوطی کی تفسیر درمنثور پڑھیں اور اگر کچھ نہ پڑھ سکیں تو ۱۴۰۵ھ کا تنظیم المکاتب کا محرم نمبر پڑھیں تو ان کو معلوم ہوجائے گا کہ عزاداری رسم نہیں ہے دین ہے رسم کو بندے ایجاد کرتے ہیں جیسے تراویح ایجاد ہوئی جو بدعت ہے عبادت نہیں ہے۔ دین کا حکم خدا اور رسولؐ وامامؑ سے حاصل ہوتا ہے غم حسینؑ کے منانے کا حکم خدا نے دیا ہے مرسل اعظم نے خود عمل بھی کیا اور حکم بھی دیا۔ حضرت علیؑ نے عمل بھی کیا اور حکم بھی دیا۔ ہمارے اماموں کو اگر کوئی امام نہیں بھی مانتا تو قابل احترام بزرگان دین بہرحال مانتا ہے جن کی محبت واجب جانتا ہے کیونکہ ان کا دشمن نجس اور اسلام سے خارج ہے۔ کسی خارجی کو بھی اس حقیقت کا علم ینابیع المودۃ، مودۃ القربیٰ، صواعق محرقہ اور دوسری سیکڑوں اجلاء علماء اہل سنت کی کتابوں سے معلوم ہوجائے گا۔ ان اماموں نے خود بھی مجالس کی ہیں روئے ہیں اور رونے کا حکم دیا ہے نہ رونے کی شکایت ہے حسینؑ کا غم کرنے کے طریقے بتلائے ہیں۔ اسلام میں عزاداری دین ہے رسم نہیں۔ البتہ خارجی کی نظر میں اسلام دین نہیں ہے بلکہ رسم ہے عبدالعلی صاحب فاروقی نے چوک کی ہے ان کے بزرگوں نے مرنے والوں کی تحریروں کی تحریف کر کے پیش کیا ہے کیونکہ وہ جواب دینے کے لیے زندہ نہ تھے عبدالعلی صاحب فاروقی نے اچھا کیا کہ ہماری زندگی میں ہمارے خلاف الزام تراشی اور تحریف کی خود کی یا براہ راست .... یا بالواسطہ عزاداری بند کرانے والوں کی مدد اور تحریک پر کی یہ وہ جانیں اور ان کا خدا جانے۔ ہم کو اس سے بحث نہیں لیکن الحمدللہ کہ ہم کو اپنی زندگی میں ان کی تردید کا موقع ملا۔ ہم عزاداری کو دلائل کی روشنی میں دین جانتے ہیں اور کاکوروی جہالت کے

نتیجہ میں عزاداری کو رسم جانتے ہیں لکم دینکم ولی دین۔

اگر ان میں ہمت ہے تو عزاداری کو رسم ثابت کرنے کا دعویٰ کیا ہے تو دلیل بھی پیش کریں تا کہ ان کو خیبری شکست کا سامنا بھی کرنا پڑے۔ یہ مجروح دل کی ایک بے تاب فریاد تھی جو قلم سے نکل گئی۔ یہ تو ایک شقشقہ تھا جو غلام جناب امیرؑ کے قلم سے ادا ہوگیا ورنہ اصل مدعا تو یہ ہے کہ ہم کو عالم انسانیت کے نجات دہندہ حضرت مہدیؑ کے ظہور سے پہلے اپنے کو ظہور کے قابل بنانے کی کوشش میں تن، من، دھن سے لگ جانا چاہیے اور کاروان منتظرین کو عہد ظہور کی طرف فکری، عملی، عقائدی، عقیدتی طور پر بڑھنا چاہیے۔

اے خدا ہماری دعا کو قبول کر۔ ایسی کریم عالمی حکومت قائم فرما جو اسلام و اہل اسلام کو عزت دلائے۔ اور نفاق و اہل نفاق کو خاک چٹا دے۔ ہم کو تیری اطاعت کی طرف بلانے والوں میں شامل فرما۔ اور تیرے راستہ کی طرف لے جانے والوں میں شامل فرما۔ ہم کو دین و دنیا کی عزتیں عطا فرما۔ اے خدا! ہم کو یہ دعا بھی تیری آخری حجتؑ نے تعلیم کی ہے لہٰذا انہیں کا واسطہ کہ ہماری اس دعا کو قبول فرما۔ ہماری غلطیوں کو معاف فرما۔ لغزشوں کو بحل فرما۔ ہر لمحہ ہماری رہبری فرما۔ ہماری توفیق میں اضافہ فرما۔ ہمارے حقیر اعمال کو قبول فرما۔

بحق محمد و آلہ الطاهرین یا ارحم الراحمین

رویت ہلال کا ایک علمی اور قومی جائزہ

مسلمانوں میں چاند کا مسئلہ ہر سال موسمی طور پر زیر بحث آتا ہے۔ جب ماہ رمضان اور عید گذر جاتی ہے تو بحث بھی گئی گذری ہو جاتی ہے۔ یہ بحث کبھی سنی مسلمانوں میں ہوتی ہے اور کبھی شیعہ مسلمانوں میں۔ اور اسی وقت ہوتی جب تاریخوں میں اختلاف ہو جاتا ہے۔ اس مضمون میں شیعہ نقطۂ نظر کو پیش کیا جا رہا ہے۔ جس سے برادران اسلام بھی استفادہ کر سکتے ہیں۔ اس لیے کہ اس مسئلہ سے ان کو بھی دوچار ہونا پڑتا ہے۔

پہلی بات

شیعوں کے یہاں اجتہاد کا دروازہ بند نہیں ہے بلکہ کھلا ہوا ہے۔ مرجانے والے عالم اور فقیہ و مجتہد کی تقلید نا جائز ہے ہمیشہ زندہ فقیہ کی تقلید ہوتی ہے۔ آج اگر کوئی شخص مثلاً آقائے حکیم کی تقلید پر باقی ہے تو بھی اس کے لیے لازم ہے کہ ان کی تقلید پر باقی رہنے کے لیے کسی زندگی فقیہ کی تقلید کرے۔ چنانچہ آقائے خوئی کا فتویٰ ہے کہ اگر مرنے والا فقیہ زندہ فقیہ سے اعلم تھا (زیادہ علم رکھتا تھا) تو صرف ان مسائل پر اس کے مرنے کے بعد عمل ہوسکتا ہے جو مسائل مرحوم فقیہ کی زندگی میں مقلد کو معلوم تھے۔ اور آج بھی یاد ہیں اگر نہیں جانتا تھا یا بھول چکا ہے تو میت کی تقلید پر باقی نہیں رہ سکتا اور آقائے

خمینی کا فتویٰ ہے کہ بنا بر ظاہر مرحوم اعلم کے تمام مسائل پر عمل کرسکتا ہے بشرطیکہ اس کی زندگی میں اس کے کچھ مسائل کر چکا ہو۔ پھر بھی احوط یہی ہے کہ زندہ مجتہد کے مسائل پر عمل کرے۔ دونوں حضرات اس بات پر متفق ہیں کہ زندہ کی تقلید کے بغیر اگر مردہ کی تقلید پر باقی رہے تو گویا اس نے تقلید ہی نہیں کی۔

دوسری بات

احکام خدا یا قرآن مجید میں پائے جاتے ہیں یا چودہ معصومین علیہم السلام کی حدیثوں میں اور قرآن وحدیث سے حکم خدا معلوم کرنے کے ضوابط وقواعد کے علم کا نام اصول فقہ ہے۔ جس شخص کو قرآن مجید، احادیث، اصول فقہ اور متعلقہ علوم پر کامل مہارت نہیں ہے وہ حکم خدا معلوم کرنے سے قاصر ہے ایسے افراد کو عوام کہا جاتا ہے اور جن کو کامل مہارت حاصل ہوتی ہے ان کو فقیہ کہا جاتا ہے اور فقیہوں میں جس کا علم سب سے زیادہ ہوتا ہے اس کو اعلم کہا جاتا ہے اور عوام پر اعلم کی تقلید واجب ہے۔ اعلم کی تشخیص کے اصول کی تفصیل توضیح المسائل وغیرہ میں دیکھی جاسکتی ہے۔ یہاں اس سے بحث نہیں کرنا ہے۔ بلکہ اس بات کی تشریح کرنا ہے کہ دو فقیہوں کے فتوؤں میں فرق کیوں ہوتا ہے مثلاً چاند کے مسئلہ میں آقائے حکیم طاب ثراہ اور آقائے خمینی مدظلہ افق کے قائل ہیں کہ جن مقامات کا افق ایک ہے اگر ان میں سے کسی مقام پر چاند دیکھ لیا جائے تو دوسرے مقامات کے لیے چاند ثابت ہوجائے گا۔ لیکن افق سے باہر مقامات کے لیے چاند ثابت نہ ہوگا۔ اس کے برخلاف آقائے خوئی مدظلہ اس بات کے قائل ہیں کہ اگر دنیا میں کسی جگہ بھی چاند دیکھ لیا جائے تو جہاں چاند دیکھا گیا ہے اس وقت جہاں سے جہاں تک رات

ہے ان سب کے لیے چاند ثابت ہوجائے گا اور نیا مہینہ شروع ہوجائے گا۔ چونکہ مہینہ چاند رات سے شروع ہوتا ہے لہٰذا جب دوسرے مقامات تک رات رہے گی تو ان کے لیے بھی نیا مہینہ شروع ہوجائے گا۔ توضیح المسائل جو دوبارہ چھپ گئی ہے اور دستیاب ہے اس میں تفصیل کے ساتھ آقائے خوئی مدظلہ کے ان دلائل کا تذکرہ ہے جن سے افق کی ضرورت باقی نہیں رہتی ہے بلکہ دنیا میں کسی جگہ چاند کا دکھائی دینا نیا مہینہ شروع کرنے کے لیے کافی ہے۔ ان کے دلائل میں سے دو باتیں یہاں اس لیے بیان کی جاتی ہیں کہ ان کا سمجھنا عوام کے لیے بھی آسان ہے۔

(۱) سورہ انا انزلنا میں شب قدر (لیلۃ القدر) کا ذکر ہے جس رات کو قرآن نازل ہوا ہے اور جس رات کو ملائکہ احکام الٰہی لے کر خدا کی خدمت میں حاضر ہوتے ہیں۔

(۲) نماز عید میں جو قنوت پڑھا جاتا ہے اس میں دعا مانگی جاتی ہے کہ اے خدا تجھے آج کے دن کا واسطہ جس کو تو نے مسلمانوں کے لیے عید قرار دیا ہے آغا خوئی کا فرمانا ہے کہ شب قدر جس میں قرآن نازل ہوا وہ ایک رات تھی نہ کہ ہر افق کے حساب متعدد راتیں۔ اسی طرح جس رات کو احکام الٰہی لے کر ملائکہ اترتے ہیں وہ بھی کوئی ایک ہی رات ہے نہ کہ زمین کے ہر حصہ کے لیے الگ راتوں میں ملائکہ نازل ہوتے ہوں۔ اسی طرح خدا نے ایک دن کو عام مسلمانوں کے لیے عید قرار دیا ہے نہ کہ علاقائی سطح پر الگ الگ دنوں کو عید قرار دیا ہے۔ آقائے خوئی کے فتویٰ کی بنیادی بات یہ ہے کہ چاند گردش کرتے کرتے کچھ وقت کے لیے (تقریباً ڈھائی دنوں کے لیے) اس طرح وہ

سورج کی شعاعوں کی زد میں آجاتا ہے کہ دنیا میں کسی جگہ بھی نہیں دیکھائی دیتا
ہے۔اس زمانہ کو تحت الشعاع اور محاق کہا جاتا ہے۔اور جب وہ محاق سے باہر
آجاتا ہے تو پھر دکھائی دیتا ہے۔آغا خوئی کہتے ہیں کہ محاق سے باہر آجانے پر
نیا مہینہ شروع ہوجاتا ہے اور دنیا میں کسی جگہ بھی دیکھا جانا اس بات کی دلیل
ہے کہ چاند محاق سے باہر آگیا ہے۔جو علماء آقائے خوئی سے متفق نہیں ہیں ان
کا خیال ہی ہے کہ چاند اس افق میں دکھائی دے جس افق میں وہ مقام ہے
تب اس مقام کے لیے چاند کی رویت ثابت ہوگی۔

میں نے مسئلہ کی بنیاد واضح کرنے کی کوشش کی ہے تا کہ فتویٰ کا فرق واضح
ہوجائے البتہ عوام یعنی غیر فقیہ افراد کی علمی بساط سے باہر ہے یہ طے کرنا کہ کس کا فتویٰ اور
کس کے دلائل درست ہیں یا نادرست ہیں۔ہمارے عوام یہی غلطی اکثر کرتے ہیں جس
کی ایک وجہ یہ ہے کہ چونکہ بہت سے عوام نے علماء کا لباس پہن لیا ہے اور عالم کا لقب
حاصل کرلیا ہے۔ان کی کم علمی اور بے عملی کو دیکھ کر ان عوام میں بھی بحث میں دخل دینے
کی ہمت پیدا ہوجاتی ہے جو لقب اور لباس علماء حاصل نہ کرسکے ہیں۔کیونکہ اصل میں
دونوں عوام ہیں بلکہ وہ عوام بہتر ہیں جنہوں نے اپنے کو عوام باقی رکھا ہے انہوں نے غلط
دعویٰ اور فریب اور جھوٹ کے الزام سے اپنے کو محفوظ رکھا ہے جبکہ عوام کی پہلی قسم نے ان
الزامات کے لیے راستہ پیدا کرکے اپنی دنیا اور دین دونوں کو نقصان پہنچایا ہے۔ورنہ جس
شخص کو قرآن مجید، احادیث، اصول فقہ، اور دیگر متعلقہ پہنچایا ہے۔ورنہ جس شخص کو
قرآن مجید، احادیث، اصول فقہ، اور دیگر متعلقہ علوم پر مہارت نہیں ہے۔اس کو فقہی بحث
میں دخل دینے کا کیا حق ہے۔

ایک طرف عوام یہ غلطی کرتے ہیں کہ بغیر علم علمی بحث میں دخل دیتے ہیں
دوسری طرف بعض بالکل بے خبر عوام اس شک میں پڑجاتے ہیں کہ جب دین ایک ہے۔
شریعت ایک ہے۔قرآن مجید ایک ہے۔ائمہ علیہم السلام کے ارشادات میں تضاد نہیں
ہوسکتا۔

تو پھر علماء اور فقہاء کے فتوؤں میں کیسے فرق ہوسکتا ہے۔حالانکہ یہی حضرات
اس بات سے واقف ہیں کہ ایک مقدمہ کا فیصلہ جب سپریم کورٹ کی ایک بنچ کرتی ہے تو
باوجود اس کے مقدمہ ایک ہوتا ہے۔مسل کے تمام کاغذات ایک ہوتے ہیں۔ثبوت،
گواہی، صفائی سب کچھ ایک ہوتا ہے۔قانون بھی ایک ہوتا ہے جس کے تحت مقدمہ کا
فیصلہ ہوتا ہے پھر بھی ججوں کی رائے اور فیصلہ میں فرق ہوتا ہے۔وجہ صاف اور ظاہر ہے
کہ فرق رائے اور فیصلہ میں ہے نہ کہ قانون میں۔اسی طرح شریعت کے احکام دو طرح
کے ہیں ایک صریح جیسے نماز واجب ہے دوسرے غیر صریح جیسے تیسری چوتھی رکعت میں
تسبیحات اربعہ کو ایک بار پڑھنا کافی ہے یا تین بار پڑھنا ہے۔غیر صریح احکام میں فقیہ
قرآن وحدیث واصول فقہ وغیرہ کے پیش نظر فیصلہ کرتا ہے۔اس فیصلہ کو فتویٰ کہتے ہیں۔
جس طرح ججوں کی رائے میں فرق ہوسکتا ہے اسی طرح فقیہوں کے فتوے میں فرق ہوتا
ہے۔یہ مذہب کا اختلاف نہیں ہے بلکہ قرآن وحدیث کو مسئلہ پر منطبق کرنے میں فیصلہ کا
فرق ہے۔

شیعہ مذہب میں کسی فقیہ کو اپنی کوئی رائے دینے کا حق نہیں بلکہ تفصیل دلائل
سے جو حکم خدا اس کی نظر میں ثابت ہوتا ہے اس کا بتلانا اس کا فریضہ ہے۔زیر بحث مسئلہ
میں بھی یہی بات ہے کہ آقائے خوئی مدظلہ چاند کے محاق سے باہر آجانے کو نیا مہینہ

شروع کرنے کے لیے کافی سمجھتے ہیں اور محاق سے باہر آجانے کا ثبوت دنیا میں کسی جگہ چاند کا دکھائی دینا ہے جس کے مفصل دلائل توضیح المسائل، منہاج الصالحین میں پڑھے جاسکتے ہیں۔

دوسرے علماء نیا مہینہ شروع کرنے کے لیے چاند کا دیکھا جانا ضروری خیال کرتے ہیں۔لہٰذا افق کی قید لگاتے ہیں۔ بنابریں اگر چاند کسی مقام پر مشرق میں دیکھا گیا ہے چاہے کتنی ہی دور کیوں نہ ہوتو ثبوت کے لیے کافی ہے کہ یقیناً چاند نکلا مگر ہم کسی وجہ سے نہیں دیکھ سکے۔لیکن اگر مغرب میں افق کے بعد کے کسی علاقہ میں دیکھا گیا تو اس کے معنی یہ ہیں کہ اس علاقہ میں چاند نہیں نکلا ہے لہٰذا نہیں دکھائی دیا۔

اس تھوڑی سی تفصیل کے بعد ان کو مطمئن ہوجانا چاہئے جو علماء کے مختلف فتوؤں پر بھڑکتے ہیں اور ان کو بھی دخل در معقولات سے باز آجانا چاہئے جو فقیہ نہیں ہیں اور دخل دیتے ہیں اور عوام میں اتنا شعور پیدا ہونا چاہئے کہ وہ عوام اور فقیہ کے فرق کو باخبر افراد کے ذریعہ معلوم کرسکیں تاکہ لقب وخاندان ولباس کا نام علم نہ ہوجائے۔ ورنہ ہمیشہ قوم کی ذلتیں نصیب ہوتی رہیں گی۔

تیسری بات

دوعیدوں کا ہوجانا یا ماہ رمضان کی تاریخوں میں اختلاف ہوجانا ایک شرعی مسئلہ ہے۔جس کی پابندی تقلید کے لازم ہونے کی بنا پر لازم ہے اور اس میں کوئی قومی توہین نہیں ہے۔ چونکہ ہندوستان میں عید کو تہوار کی حیثیت سے منایا جاتا ہے لہٰذا مسئلہ مذہبی نہیں رہا ہے بلکہ قومی بن گیا ہے۔ ورنہ شرعی طور پر کس نے کس دن روزہ رکھا۔کس

نے کس دن نماز عید پڑھی اس میں نہ کوئی قباحت ہے نہ کوئی توہین ہے۔عید ایک دن ہوجائے کا مطالبہ صرف تہوار کی بنیاد پر ہے ورنہ حج کے لاکھوں حاجیوں کو بقرعید کے آنے اور جانے کا احساس بھی نہیں ہوتا جس کو جس وقت موقع ملتا ہے وہ وقت کے اندر نماز عید پڑھ لیتا ہے۔ بہت سے مسلمان ملکوں میں نماز صبح کے بعد ہی نماز عید بھی ہوجاتی ہے۔ یعنی عید ہوجاتی ہے تہوار نہیں ہوتا ہے۔ جب تک ہم مذہب کے بجائے سماج کو اور عید کے بجائے تہوار کو مانتے اور مناتے رہیں گے ہم کو قومی توہین کا احساس ہوتا رہے گا۔ اصل میں قومی توہین ہے رمضان میں روزہ نہ رکھنا۔ دن میں علی الاعلان کھانا پینا۔عید کے دن گانا بجانا۔مگر ہم کو اس قومی توہین کا احساس نہیں ہوسکتا کیونکہ یہ شروع کی مخالفت ہے اور سماج اس میں ساتھ ہے۔

قمری مہینہ میں تاریخوں کے فرق کے ختم ہونے کا ایک امکان ہے جو مستقبل میں پیدا ہوسکتا ہے کہ جس طرح طلوع وغروب آفتاب کے اوقات حتمی طور پر علمی سطح پر طے ہوگئے اسی طرح جب علمی سطح پر حتمی طور پر یہ طے ہوجائے کہ فلاں تاریخ کو چاند محاق سے یقیناً باہر آجائے گا تو ساری دنیا میں عید ایک دن ہوسکے گی بشرطیکہ افق کی قید شرعی طور پر باقی نہ رہے۔ابھی آقائے خوئی یا آقائے خمینی اور دیگر علماء دام ظلہم کی نظر میں علمی سطح اس قابل نہیں ہے کہ اس پر اعتماد کیا جاسکے۔ بلکہ دیکھا جانا دونوں کی نظر میں ضروری ہے۔

ایک نظر میں افق کے حدود میں دیکھا جانا ضروری ہے دوسرے کی نظر میں کہیں بھی دکھائی دے جانا کافی ہے۔ چونکہ اجتہاد زندہ ہے ممکن ہے کہ مستقبل میں اس مسئلہ کا حل نکل آئے لیکن ہم کو اپنی شرعی ذمہ داری کو پورا کرنا ہے بغیر اس فکر کے لوگ کیا کہتے

ہیں اور قومی توہین ہوتی ہے یا نہیں۔ اصل قومی توہین ہے شریعت کی نافرمانی اور قومی اعزاز ہے پابندی دین۔

آخری بات

علمی گفتگو کے بعد ضروری ہے کہ مسئلہ کے عملی رخ پر بھی غور کیا جائے۔ شیعہ مسلمانوں میں رویت ہلال کمیٹی کا دائرہ کار بہت محدود ہے۔ وسائل بہت کم ہیں ضرورت ہے اس کو منظم کرنے کی اور وسیع تر بنانے کی تاکہ اطلاع فوراً حاصل بھی کی جاسکے۔ اور جلد از جلد ہر جگہ پہنچائی بھی جاسکے۔ اس میں ایک کام بہت آسان ہے کہ حکومت سے درخواست کی جائے کہ وہ چاند سے متعلق شیعہ اعلان کو ریڈیوں سے اتنی بار نشر کرے کہ سب کو خبر ہو جائے۔ اور مومنین کو متوجہ کیا جائے کہ وہ ریڈیو برابر سنیں اور ریڈیو پر خبر کو نشر کرنے کے لیے جو شرعی قواعد ہیں ان کی پابندی کا مکمل انتظام کیا جائے تاکہ ریڈیو کا اعلان شرعی حیثیت اختیار کر سکے۔ اس کے لیے ضرورت ہے کہ متدین رویت ہلال کمیٹی کی جس کا ہر فرد عالم باعمل ہو جس پر شرعاً اعتماد کیا جاسکے۔ دوسری ضرورت ہے کہ اس کے پاس اتنا فنڈ ہو کہ وہ اپنا مواصلاتی نظام قائم کر سکے۔ تیسری ضرورت اتنے پروپیگنڈے کی پوری قوم باخبر رہے اور تعاون کر سکے۔

بے لکھی تحریر کی روداد غم

ابن عباس جو رسولؐ اللہ کے چچازاد بھائی بھی ہیں اور صحابی بھی ہیں اور صحابی بھی۔ عام مسلمانوں میں اس سے بڑا مفسر قرآن دوسرا نہیں بے شمار حدیثیں ان سے مروی ہیں۔ حبر امت، ان کا لقب ہے۔ تاریخ اسلام کے دونوں بڑے فرقے (شیعہ سنی) احترام سے ان کا نام لیتے ہیں۔ وہ راوی ہیں کہ حضورؐ نے اپنے انتقال سے ۵ دن پہلے اپنی بیماری کو طول کھینچتے دیکھ کر اصحاب سے قلم دوات و کاغذ مانگا تاکہ ایسی تحریر لکھ دیں جس کے بعد امت گمراہ نہ ہو۔ حضرت عمر نے مخالفت کی اور صرف نظریاتی مخالفت نہیں بلکہ جذباتی مخالفت اور اس حد تک جذبات میں شدت اختیار کی کہ حضور پر ہذیان (بکواس) کا الزام لگایا تحریر لکھنے کے بجائے قرآن کو کافی کہا۔ ازواج میں سے ''بعض نے'' حضورؐ کی حمایت کی ان کو بھی حضرت عمر نے برا بھلا کہا۔ یہاں تک کہ حضور کو مداخلت کرنی پڑی کہ یہ ازواج جیسی بھی ہیں تم سے بہر حال بہتر ہیں میرے پاس سے اٹھ جاؤ کیونکہ نبی کے پاس جھگڑا کرنا مناسب نہیں۔

ابن عباس صرف اس واقعہ کے راوی نہیں ہیں بلکہ زندگی بھر اس واقعہ کو یاد کر کے روتے تھے اور اتنا روتے تھے کہ جس جگہ بیٹھ کر روتے تھے وہ جگہ آنسوؤں سے تر ہو جاتی تھی۔ یہ واقعہ جمعرات کو پیش آیا تھا۔ حضورؐ کی وفات دوشنبہ کو ہوئی تھی لہٰذا ابن عباس ''یوم الخمیس و ما یوم الخمیس'' جمعرات اور ہائے جمعرات کہہ کر روتے تھے۔ اس

واقعہ کو دوسرے کتابوں کے علاوہ صحیح بخاری نے بھی ایک بار نہیں بلکہ سات مرتبہ بیان کیا ہے۔

(۲)

علامہ شبلی جنہوں نے اس صدی میں مذہب اہل سنت کی ترویج واشاعت میں بے حد نمایاں حصہ لیا ہے اور اگر ان کو سنی مذاق کے مطابق اس صدی ''مجدد مگر ہندی'' کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔انہوں نے اپنی ساری عقلی، قلمی اور سیاسی توانائی صرف کر کے اپنے مذہب کو ہر طرح چمکدار بنانے کی کوشش کی ہے۔اگر برا نہ مانا جائے تو یہ ایک حقیقت ہے کہ جس طرح سوامی دیانند سرسوتی (مصنف ستیارتھ پرکاش) بانی آریہ سماج نے ہندو مذہب کے نقائص کو دیکھ کر اس کو اپنے خیال میں ہر طرح مضبوط اور مطابق وقت وماحول بنانے کی کوشش کی اور اس سلسلے میں ان کو ہندو مذہب کی بہت سی باتوں کا انکار کرنا پڑا۔ بہت سی باتوں کی نئی تاویل کرنی پڑی کچھ ضدوں سے اور کسی جگہ ڈھٹائی سے کام لینا پڑا اور پرانے ہندودھرم کا نیا ایڈیشن آریہ سماج پیدا ہوگیا جو چل نکلا۔اسی طرح مولانا شبلی نے بیسویں صدی کے روشن تر دماغ اور اپنے پرانے عقائد کو دیکھ کر محسوس کیا کہ عقل کو معطل کرنے والے مذہب کی بیل اس علمی اور روشن زمانہ کے دماغوں پر نہ چڑھے گی تو موصوف نے بھی اپنے مذہب کی تجدید کی جس میں تجدد سے بھی کام لیا۔ روایت، درایت کے ذریعہ الٹ پھیر بھی کی۔ واقعات اور حقائق سے انکار بھی کیا۔ چنانچہ مذکورۂ بالا واقعہ کے بارے میں بھی موصوف کی روش یہی ہے۔الفاروق میں اس موضوع پر جو کچھ لکھا ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ صحیح بخاری میں مذکورۂ بالا واقعہ درج ہے اور

اس کے صاف اور واضح نتائج یہی ہیں کہ ہذیان کا الزام لگانے والا نہ صرف توہین نبی کرتا ہے بلکہ اس کا ایمان بھی مخدوش ہے اور صحیح بخاری میں یہ واقعہ حضرت عمر کے لیے لکھا ہے جو تاریخ اسلام کے مہر و ماہ ہیں مگر حضرت عمر سے ایسا ہو نہیں سکتا۔لہٰذا دو صورتیں ہیں یا واقعہ کو سچا مان کر حضرت عمر کو برا تسلیم کیا جائے یا حضرت عمر کی پوزیشن کو مستحکم مانتے ہوئے واقعہ سے انکار کیا جائے اور موصوف نے طے کیا کہ واقعہ غلط ہے۔توجیہ بیان کی کہ کسی دوسرے صحابی نے اسے بیان نہیں کیا۔حضرت ابن عباس تیرہ برس کے کمسن میں ان کا بیان معتبر نہیں۔لہٰذا سچا واقعہ جھوٹا ہے اور حضرت عمر مجرم در کنا ملزم بھی نہیں ہیں بلکہ بری ہیں۔

علامہ شبلی کے اس فیصلے پر حیرت نہیں ہونا چاہئے جبکہ آپ کے پہلے خلیفہ حضرت ابوبکر فدک کے مقدمے میں خود ہی فریق بھی ہیں اور خود ہی فیصلہ بھی کرتے ہیں جس انصاف کو آج کی کافر حکومتیں بھی جائز نہیں مانتیں وہ آپ کی حکومت کے صدر اول کی روشن ضمیری ہے۔جب مکتب وملا کا یہ عالم ہو تو ''کار طفلاں'' کا شبلی بننا حیرت ناک نہیں ہے مگر حیرت ناک بات یہ ہے کہ جب کوئی روایت پیش کرو تو سنی بڑے طمطراق سے کہتے ہیں کہ بخاری میں نہیں ہے لہٰذا غیر معتبر اور جب کوئی واقعہ بخاری میں نکلے تو بخاری غیر معتبر۔کوئی بتائے جب سب ناتحقیق ہیں تو پھر بات کس سے کی جائے اور کیونکر؟

(۳)

اب ذرا علامہ شبلی سے بھی دو دو باتیں کر لیجئے۔کسی دوسرے صحابی نے نہیں

بیان کیا صرف تیرہ برس کے کمسن ابن عباس کا بیان ہے جو معتبر نہیں بات ٹھیک ہے۔مگر:

۱۔ امام بخاری نے اسے معتبر سمجھ کر اپنی صحیح بخاری میں ۷ جگہ نقل کیوں کیا؟ نقل کیا تھا تو اس پر اپنا انکاری نوٹ کیوں نہ لکھا۔انہوں نے نہیں لکھا تھا تو آج تک کسی سنی عالم نے صحیح بخاری سے اس کو نکالا کیوں نہیں؟ نہیں نکالا تھا تو فٹ نوٹ میں اس کا ضعیف ہونا ہی درج کرتے کیا عقل اور اپنے مذہب کی حمیت بے جا کے ساتھ حمایت کا عطیہ صرف علامہ شبلی ہی کے حصہ میں آیا۔کیا آج کوئی سنی بزرگ ان سوالات کے جواب مرحمت فرمائیں گے۔

۲۔ دوسرے کسی صحابی نے کیوں نہ بیان کیا۔ پہلے یہ سوچنا چاہئے کہ اگر دوسرے کسی صحابی کو یہ بات ناگوار ہوئی ہوتی اس نے حضورؐ کی زندگی میں احتجاج کیا ہوتا لیکن جب زبان وضمیر جماعت (پارٹی) کو دے چکے تھے جس کی فیس ممبری دین ودیانت کو خیر باد کہنا تھا تو اب بیان کیوں نہ کیا۔کا مطالبہ طفلانہ ضد تو ہوسکتی ہے۔عاقلانہ مطالبہ نہیں ہوسکتا۔

۳۔ تیرہ سالہ کمسن ابن عباس نے اسی وجہ سے بیان کر دیا کہ ان پر کمسنی نے جماعت کا رنگ نہیں چڑھنے دیا تھا۔لہٰذا فطرت بول رہی تھی مصلحت کی تالہ بندی نہیں ہوسکی تھی۔ جرم کی شہادتیں سن والوں سے کم ملتی ہیں البتہ کم سن حقیقت کہہ جاتے ہیں۔اس حقیقت کو علامہ شبلی بھی جانتے ہیں مگر کم سن نہیں ہیں جو اس کا اقرار بھی لیں۔

۴۔ تیرہ سالہ کمسن ابن عباس کا بیان حضرت عمر کے بارے میں غیر معتبر ہے تو پھر حدیث، تفسیر، تاریخ میں وہ سب کچھ غیر معتبر ہے جو ابن عباس نے تیرہ سالہ

کمسنی کے زمانے میں بیان کیا ہے۔مگر مذہب کیسے چلے اگر اتنی سی معقول بات بھی سوچ لی جائے۔''یک بام ودو ہوا'' ناکارہ ایجاد نہیں ہے لہٰذا حضرت عمر کی حمایت میں اس سے کام کیوں نہ لیا جائے۔

۵۔ اس واقعہ کے بارے میں شیعہ سنی نقطۂ نظر کو ایک جملہ میں یوں بیان کیا جاسکتا ہے کہ شیعہ نظریہ ہے کہ حضرت عمر نے حضورؐ سے بے ادبی کی لہٰذا ہم ان کو نہیں مانتے۔سنی نظریہ ہے کہ حضرت عمر کو ہم مانتے ہیں لہٰذا بے ادبی والے واقعہ کو ہم جھوٹا مانتے ہیں۔ بات واضح تھی اور ہے۔اب اللہ کی بارگاہ میں حضور بھی ہیں اور محمود وایاز حضرت عمر وعلامہ شبلی ایک صف میں کھڑے ہو چکے ہیں بات صرف بقیہ ''ایازوں'' کی ہے کہ وہ ''روبہ توہین پیغمبر ہوکر'' قوم حضرت عمر میں شامل ہوتے ہیں یا نہیں۔

وماعلینا الاالبلاغ

(۴)

دنیا میں ہزاروں قتل ہوئے جن کا پتہ نہ لگا کتنے قاتل عدالت میں جا کر بری ہوگئے کتنے سچے تھے جو جھوٹے قرار پائے۔ کتنے جھوٹے ہیں جو سچے مان لیے گئے۔ حضرت عمر ہی کے زمانے میں جب زانی مغیرہ بن شعبہ بری ہوگئے اور سچے ابوبکرہ سچی گواہی دینے پر ''فاروقی'' درہ کھا گئے تو اگر آج صدیوں بعد سچے واقعہ قرطاس کو جھٹلایا جائے تو کون سی بڑی بات ہے۔مگر صحیح بخاری اور دوسرے کتابیں جو اس واقعہ کو بیان کررہی ہیں ان کو اب مٹانا اور دریابرد کرنا کسی کے بس کی بات نہیں اور کوئی تدبیر اس

بات کو سوچنے سے نہیں روک سکتی کہ جب واقعہ جھوٹا تھا تو حضرت عمر کو سچا اور خلیفہ راشد
مان کر جنت کے طلبگار حضرات اہل سنت کے ان جلیل عالموں محدثوں اور مورخوں نے
اس واقعہ کو کیوں بیان کیا۔ بس اب تدبیر یہی باقی ہے کہ دعا کیجئے کہ ساری دنیا ہمیشہ کے
لیے پاگل ہو جائے پھر کوئی آپ سے اس واقعہ کے بارے میں کچھ نہ پوچھے گا ورنہ عقل
کے رہنے تک اس واقعہ پر ضرور بحث ہوگی اور حقیقت معلوم ہو کر رہے گی۔ البتہ چند اور
باتیں ہیں جن کو معلوم کرنا واقعہ کے سمجھنے والے کے لیے ضروری ہے اور اس تحریر میں ان
ہی باتوں کی طرف توجہ دلانا ہے۔

(۵)

پہلی بات یہ ہے کہ حضورؐ نے صرف تحریر لکھنے کے لیے کہا تھا لکھی نہ تھی۔ مگر
حضرت عمر اس کی مخالفت پر بضد ہو گئے۔ جس کے معنی یہ ہیں کہ وہ لکھنے سے پہلے سمجھ گئے
کہ حضور کیا لکھیں گے۔ اور جو لکھیں گے وہ آپ اور آپ کی جماعت کے مفاد کیلیے کس
قدر مضر ہے۔ بس اسی قدر مضر تھا کہ آپ آخری حد تک مخالفت پر اتر آئے اور اس موقع کو
اگر خاموشی سے جانے دیتے تو مستقبل کا منصوبہ صرف دماغ میں رہ جاتا۔ ''خلافت
راشدہ'' کی بنیاد پھر کیسے پڑتی مگر سوال یہ ہے کہ آپ حضورؐ کی بے لکھی تحریر کو کیسے سمجھ
گئے۔ صرف آپ ہی سمجھ جاتے اور جماعت نہ سمجھتی تو کوئی نا سمجھ آپ کے ''ہذیانی'' کلمے
کے خلاف ضرور احتجاج کرتا۔ ظاہر ہے کہ آپ علم غیب نہ رکھتے تھے اور نہ آپ پر وحی یا
الہام ہوتا تھا اور نہ مخالفت رسولؐ میں الہام یا وحی کا ہونا ممکن ہے پھر بے لکھی تحریر پڑھی
کیسے گئی دوربین تو ممکن ہے مل جاتی یہ ''معدوم بین'' فوراً کیسے ہاتھ لگ گئی جس میں پوری

جماعت نے سب کچھ فوراً پڑھ لیا۔ یہ بات بہت معمولی ہے صرف واقعات پر نظر رکھنے کی
ضرورت ہے چونکہ حضورؐ اپنی علالت سے پہلے اور علالت کے زمانے میں برابر فرماتے
تھے کہ امت کو تنہا چھوڑ کر نہیں بلکہ قرآن و اہلبیتؑ کو چھوڑ کر جا رہا ہوں جن کا ماننے والا
''ہرگز گمراہ نہ ہوگا'' اور اس تحریر کا مقصد بھی آپ نے یہی بیان فرمایا تھا کہ اس کے بعد
''تم ہرگز گمراہ نہ ہوگے'' بس اسی فقرے کے اتحاد نے بے لکھی تحریر کا مطلب سمجھا دیا۔
معلوم تھا نبیؐ جس تجویز ہدایت (تمسک بہ قرآن و اہلبیتؑ) کو پیش کر چکے ہیں اسی کو لکھ کر
دیں گے۔ تجویز سمجھ میں نہ آئی ہوتی تو ''صرف کتاب خدا کافی ہے'' کی ترمیم نہ پیش کی
جاتی ہے۔

معلوم ہوا کہ واقعہ یہ نہیں ہے کہ تحریر جو حضورؐ نہ لکھ سکے وہ لکھی نہ گئی۔ لکھی گئی مگر
حضور کے قلم سے اور آپ کے الفاظ میں نہیں بلکہ حضرت عمر کی مخالفت کے واقعاتی الفاظ
و قلم نے اس کو لکھا۔ لہٰذا یہ مطالبہ غلط ہے کہ پھر حضرت علیؑ نے کیوں نہ لکھوا لیا۔ تب
لکھواتے جب واقعی کسی کو معلوم نہ ہوتا کہ حضورؐ کیا لکھنے والے ہیں مگر جب سب پڑھ
چکے تھے کہ حضور کیا لکھیں گے تو اب حضرت علیؑ کیا لکھواتے البتہ حضورؐ کی بات نہیں مانی
گئی اور جو آپ لکھ کر امت سے منوانا چاہتے تھے اس کے ماننے سے لکھنے سے پہلے ہی
انکار کر دیا گیا تو بات اب لکھوانے کی نہیں منوانے کی تھی۔ جب حضور نے منوا سکے تو
حضرت علیؑ کیسے منواتے؟

(۶)

دوسری وجہ حضرت علیؑ کے نہ لکھوانے کی یہ تھی کہ اس تحریر کا اب لکھوانا کسی مقصد

کے لیے مفید نہ تھا سوا اس کے کہ حضورؐ کی مسلسل توہین کرائی جاتی اور ایسی توہین جس کا تسلسل نبوت ہی کو بنیاد سے کمزور کر دیتا جس کی تفصیل یہ ہے کہ۔ پہلے یہ بات سمجھنے کے قابل ہے کہ حضرت عمر نے حضورؐ سے جب تحریر لکھے جانے پر مخالفت کی تو اس مخالفت کا مقصد صرف اسی وقت تحریر کا نہ لکھا جانا تھا چاہے بعد میں حضور لکھ دیتے یا مقصد یہ تھا کہ یہ تحریر حضورؐ کی زندگی بھر نہ لکھی جائے ظاہر ہے کہ وقتی طور پر مخالفت کا کوئی فائدہ نہ تھا بلکہ ہر شخص اس سے اتفاق کرے گا کہ حضرت عمر یہی چاہتے تھے کہ یہ تحریر کبھی نہ لکھی جائے۔

اب سوال یہ ہے کہ حضرت عمر ہر وقت حضور کے پاس نہ رہیں گے پھر تحریر لکھنے سے ہر وقت کیسے روک سکیں گے۔ مگر مقصد یہی تھا کہ تحریر نہ لکھیں لہٰذا اس مقصد کے لیے کسی تدبیر کی ضرورت تھی۔ وہ تدبیر صرف یہ ممکن تھی کہ ایسے حالات پیدا کر دیئے جائیں کہ اگر حضور تحریر لکھیں بھی تو وہ تحریر بے کار ہو جائے اسی واسطے آپ نے صرف نظریاتی مخالفت نہیں کی بلکہ حضورؐ پر مرض کی گرانی اور آپ کی گفتگو پر ''ہذیان'' کا الزام لگایا تا کہ اگر بعد میں آپ تحریر لکھ دیں یا کوئی دوسرا شخص لکھوا لے تو موقع ہوگا کہ کہا جا سکے کہ آپ کا ذہن کام نہیں کر رہا تھا۔ آپ (معاذ اللہ) ہذیانی باتیں کر رہے تھے۔ ایسی حالت میں جو چاہے لکھوا لے۔ اگر مذکورہ بالا سیاسی مقصد نہ ہوتا تو حضرت عمر جیسا ''مدبر اور سیاستداں'' بے سبب و بلا وجہ حضور کے بارے میں ہذیان کا سخت لفظ استعمال نہ کرتا اور اپنے کو قیامت تک کے لیے ہدف اعتراض و ملامت نہ بناتا اور اگر ہذیان کا لفظ حضرت عمر نے استعمال نہ کیا ہوتا تو علامہ شبلی کو بخاری کے جھٹلانے، ابن عباس کو کمسن بتانے اور سچے واقعے کے انکار کی ضرورت ہی پیش نہ آتی بلکہ بحث کا رخ دوسرا ہوتا کہ حضرت عمر نے مفاد اسلام کے لیے یہ تحریر غیر مفید بلکہ مضر پائی بلکہ نقص نبوت و اسلام دور کرنے کے لیے

آپ کو مخالفت کرنی پڑی وغیرہ بحثیں ہوتیں مگر ''ہذیان'' کے لفظ نے بے چارے ماننے والوں کو عجب مشکل میں ڈال دیا ہے اس موقع پر ہم نے حضرت عمر کا ''مدبر و سیاسی'' ہونا اس لئے یاد کیا ہے کہ مدبر اور سیاسی بصیرت کے افراد قتل بھی کرتے ہیں مگر زبان کی چھری کو میٹھا رکھتے ہیں۔ اگر صرف وقتی طور پر تحریر لکھنے کی مخالفت مقصود ہوتی تو ہزار بیٹھے بہانے موجود تھے۔ مثلاً حضور کی صحت کی دہائی دے کر کہنا ممکن تھا کہ آپ اچھے ہو جائیں گے ایسی تحریر جس سے آپ کی موت کی بو آتی ہو ہم کو اس کا سننا بھی گوارہ نہیں لہٰذا نہ لکھئے۔ یا جب آپ اچھے ہو جائیں تب لکھ دیجئے گا حدیث ثقلین آپ فرما ہی چکے ہیں وہ ہم لوگوں کے لیے کافی ہے۔ غرضکہ بہت سے طریقے تھے تحریر کی مخالفت کے جن میں لہجہ سخت نہ ہوتا مگر مشکل یہ تھی کہ ہذیان کا الزام لگائے بغیر مقصد حاصل نہ ہوتا اور اس وقت خاموشی یا ڈھیل اتنی خطرناک تھی جس کے بعد مستقبل میں خلافت و حکومت کا تصور ہی ختم تھا چہ جائیکہ خلیفہ بننا اور بنانا۔ لہٰذا تقاضائے تدبر و سیاست یہی تھا کہ آخری موقع کو ہاتھ سے نہ جانے دیا جائے۔ چاہے ہذیان یا اس سے بھی سخت لفظ کیوں نہ کہنا پڑے۔ چنانچہ حضرت عمر نے موقع نہ جانے دیا۔

اس کے بعد اگر حضرت علیؑ یا کوئی دوسرا شخص بھی تحریر لکھواتا تو جب بھی اس کو پیش کیا جاتا تا مخالفت کی طرف سے حضورؐ پر ہذیان کا الزام لگتا اور آج چودہ سو سال میں اگر اس تحریر کا ۱۴ ہزار بار ذکر آتا تو ۱۴ ہزار بار حضورؐ کے ہذیان کا بھی ذکر آتا۔ پھر آخری وقت کے ہذیان کا الزام اپنی نسل پیدا کرتا اور حضورؐ کی زندگی کے کسی واقعہ کا جب بھی انکار کرنا ہوتا تو یہی کہا جاتا کہ وہ بھی ہذیان تھا بلکہ یہ اصول اور مسلمہ تاریخ بن جاتا کہ آپ پر ایسی بیماری کا حملہ برابر ہوا کرتا تھا جس حملے کے بعد آپ بہکی بہکی باتیں

کیا کرتے تھے۔ نتیجہ ظاہر ہے کہ آج پوری نبوت مشکوک بلکہ مسترد ہو جاتی غیر مسلم کو بھی
شہ ملتی۔ مسلمان بھی من مانی کرنے کے لیے اس عقیدے کی آڑ لیتے۔ ہدایت گم اور
گنگ ہو جاتی۔ اگر یہ صورت حال نہ ہوتی تو حضرت علیؑ لکھواتے یا نہ لکھواتے حضورؐ خود
ضرور لکھ دیتے۔ مگر عاقبت اندیشاں ہدایت نہ ایسی غلطی کر سکتے تھے اور نہ کی۔ اب چاند
پر تھوکا منہ پر آرہا ہے اور علامہ شبلی اور ان کے اسلاف و اخلاف اس واقعہ کو چاٹ جانے
کی کوشش کر رہے ہیں مگر تاریخ اور واقعات کو چاٹ جانا کسی سیاسی یا عقیدت کی دیمک
کے بس کی بات نہیں ہے۔

(۷)

حضرت عمر مجبور تھے کہ اپنے مقصد کو حاصل کرنے کے لیے حضورؐ کے بارے
میں مذکورہ بالا سخت لفظ استعمال کریں اور آخری حد تک روش کو سخت بنائیں اس میں ان کو
کچھ خوف نہ تھا اس لیے کہ اسلام اب ان کی جماعت میں گم ہو چکا تھا لہٰذا کسی احتجاج کا
خطرہ نہ تھا چنانچہ بالکل امید کے مطابق کسی نے احتجاج نہیں کیا۔ سوائے چند افراد کے
جن کو بھی حضرت عمر نے معاف نہ کیا۔ آخر کار حضور نے حضرت عمر کو اٹھایا مگر جب حضور
نے اٹھا دیا تو پھر کسی کی ہمت نہ تھی کہ اس وقت بٹھلا سکے۔ بعد وفات حضور خلافت کی
مسند پر البتہ بٹھلایا جا سکتا تھا اور اس پر کوئی حیرت بھی نہیں کیوں کہ مروان طرید رسول
(جسے حضور نے مدینہ سے نکال دیا تھا اور اس کا داخلہ حدود مدینہ میں بند تھا) حضرت
عثمان کے داماد اور آپ کی خلافت میں وزیر اعظم اور معاویہ بن یزید کے بعد خود خلیفہ
ہو سکتے ہیں تو پھر کون سیاہی ہے جو سفیدی کی جگہ نہیں لے سکتی۔ یہ بھی نہ ہو سکے تو گردش

لیل و نہار کے پھر کیا معنی۔ لیکن آج ضرورت ہے کہ واقعہ کے بعد حضرت عمر کے ذہن پر
خود اس واقعہ کا جو رد عمل ہوا اسے سمجھا جائے تا کہ اس سے پیدا ہونے والے نتائج اور ان
کے دور رس اثرات سمجھے جا سکیں۔

حضور نے جب حضرت عمر اور ان کی جماعت کو یہ کہہ کر اٹھا دیا (نکال دیا لکھنا
رواداری کے خلاف ہوگا اگرچہ واقعہ یہی ہے) کہ نبی کے پاس جھگڑا کرنا مناسب نہیں
لہٰذا یہاں سے چلے جاؤ تو حضرت عمر کو مع جماعت کے اٹھنا پڑا۔ حضور صرف ''چلے جاؤ''
بھی کہہ سکتے تھے مگر ''نبی کے پاس جھگڑا مناسب نہیں'' کے فقرہ کا اضافہ اس لیے فرمایا
تا کہ یہ محسوس کر لیا جائے کہ ذہن بیکار نہیں ہے۔ گفتگو ہذیان نہیں ہے بلکہ نبی اپنی ذمہ
دارانہ حیثیت سے گفتگو کر رہے ہیں اور حضرت عمر کو اٹھانے والا مریض ذہن والے محمد
نہیں بلکہ محمد رسول اللہ ہیں۔

بہر حال حضور کے ارشاد پر حضرت عمر کو مع جماعت کے نکلنا پڑا۔ واقعہ ہو چکا
اب اس کا ذہنی رد عمل شروع ہوا۔ اسے سوچئے یوں سمجھئے کہ حضرت عمر مع اپنی جماعت کے
اپنے گھر میں ہیں پورا واقعہ ذہن میں ایک تسلسل کے ساتھ گردش کر رہا ہے اور ذہن یہ
سوچنے پر مجبور ہے کہ جب بیمار نبی کا اتنا اثر ہے کہ انہوں نے مجھے نکال دیا اور ہم سب کو
آگے کے حکم کی تعمیل کرنی پڑی تو اگر نبیؐ اچھے ہو گئے تو یقیناً نکال دینے کے بعد ان کا طرز
عمل مزید سخت ہو جائے گا اور جب میں دائرہ اسلام سے خارج کیا جاؤں گا تو مجھے
بچانے والا کوئی نہ ہوگا جس طرح نبیؐ کے اٹھا دینے پر مجھے کوئی روکنے اور بٹھانے والا اس
وقت نہ تھا۔ لہٰذا اگر نبیؐ اچھے ہوتے ہیں تو میرا، میری جماعت اور میرے منصوبۂ حکومت
کا مستقبل بے حد تاریک ہے۔ واحد راستہ یہی ہے کہ پیغمبر اس بیماری سے صحت یاب نہ ہو

صحت یاب نہ ہونے کی یہ تمنا موت کو قریب لانے کے ذرائع پر بھی غور کرا سکتی ہے اور کسی مہلک اقدام پر آمادہ بھی کر سکتی ہے کیونکہ بیماری سے طبعی موت پر بندہ کا اختیار نہیں ہے البتہ قتل و ہلاکت و زہر خورانی کی ایسی صورتوں میں قہری موت کی امید کی جا سکتی ہے۔ اگر ازواج رسولؐ میں بعض اپنے موافق ہوں اور موافقت صرف رسمی یا ذاتی تعلقات کی بنا پر نہ ہو بلکہ سب ایک دوسرے کے رفقائے مقصد بھی ہوں تو کسی سازش کے منصوبہ کی طرف ذہن کے جانے کا بھی امکان ہے اور اس امکان کو ''مغافیر'' والی روایت سے قوت بھی پہنچتی ہے۔ اس روایت کا خلاصہ یہ ہے کہ ''مغافیر'' ایک سخت بدبودار گوند ہے جو حضورؐ کو مخصوص طور پر ناپسند تھا۔ جبکہ حضور ہر بدبو سے عموماً اور طبعاً متنفر تھے۔ مغافیر والی روایت کہتی ہے کہ حضورؐ کو بیماری کی شدت سے غش پر غش آ رہے تھے اور آپ نے ہدایت فرمائی تھی کہ مجھے غشی کی حالت میں کوئی چیز نہ پلائی جائے۔ اس کے باوجود حضورؐ کو جناب عائشہ نے کچھ پلایا جس کا احساس آپ کو غش سے بیدار ہونے کے بعد ہوا اور اس احساس پر آپ نے جواب طلب کیا مجھے کیا پلایا گیا ہے۔ جواب ملا ''مغافیر'' حضور کو اس برتن کی بھی جستجو ہوئی جس میں سے پلایا گیا اور اس میں اس وقت جو کچھ تھا اسے موجود لوگوں کو پلا کر دکھانے کا حکم بھی آپ نے دیا۔ میں اگرچہ اس روایت پر کوئی فیصلہ نہیں کرنا چاہتا مگر واقعات کی کڑیاں ایک دوسرے سے مل کر کچھ کہہ رہی ہیں ان کی زبان کو سمجھنا اور واقعہ یا حادثہ صرف اس بات سے بحث ہے کہ صورت حال حضرت عمر اور ان کی جماعت کے لیے بڑی شدت سے بے چین کرنے والی ہے اور جس بات سے امید کی کرن پیدا ہوتی ہے وہ صرف یہی ہے کہ حضور بیماری سے اچھے ہونے کے بجائے وفات پا جائیں اور وہی ہوا جو حضرت عمر کی جماعت کی عین تمنا تھی کہ حضور کی وفات ہو گئی۔ کیسے ہوئی،

طبعی یا غیر طبعی، اس وقت اس حصے سے بحث مقصود نہیں ہے۔ وفات کے ہوتے ہیں حضرت عمر نے خلافت کا سنگ بنیاد اپنی بیعت کے ہاتھوں رکھ دیا لیکن سنگ بنیاد خلافت حضرت ابوبکر کی بیعت نہیں ہے بلکہ آپ اور آپ کی جماعت کی تمنائے موت محمدؐ ہے۔ اور خونچکاں کش مکش کے اسباب پر مذکورہ بالا واقعہ کے جو بنیادی اثرات ہیں ان کو سمجھنا تاریخ کے ہر دیانت دار طالب علم کا فرض ہے۔

یہ واقعہ ہے کہ حضرت علیؑ سے لے کر امام حسن عسکری تک ہر امام اپنی طبعی موت کے بجائے تلوار یا زہر سے شہید ہوا اور قاتل غیر مسلم نہیں بلکہ مسلمان تھے۔ عام مسلمان نہیں بلکہ سربراہ خلافت اسلامیہ تھے اور یہ تسلسل دیکھنے کے قابل ہے کہ ہر امامِ وقت کا قاتل خلیفۂ وقت ہوتا ہے۔ حضرت علیؑ سے خلفاء ثلاثہ سے کش مکش رہتی ہے۔ گرفتار ہوتے ہیں۔ قتل کی دھمکی دی جاتی ہے۔ گھر جلانے کا انتظام ہے۔ ۲۵/سالہ دور خلافت خلفاء ثلاثہ میں حضرت علیؑ کسی جگہ بھی منظر پر نہیں آتے جب کہ رسولؐ کے زمانے میں کوئی منظر حضرت علیؑ کے کارنامے سے خالی نہیں ہے۔ اسے انقلاب نہ کہیں تو پھر انقلاب کے معنی کیا ہوں گے۔ معاویہ حضرت عثمان کے وارث اور جانشین ہو کر حضرت علیؑ سے جنگ کرتے ہیں اور ان کی سازشیں ابن ملجم کو پیدا کرتی ہیں جو آپ کا قاتل بنتا ہے۔ امام حسنؑ کو معاویہ زہر دیتے ہیں۔ یزید امام حسینؑ کا قاتل ہے۔ امام زین العابدینؑ و امام محمد باقرؑ کو فرزندان مروان شہید کرتے ہیں جو خلیفہ وقت تھے۔ امام جعفر صادقؑ کا قاتل منصور خلیفۂ وقت ہے۔ بقیہ ائمہؑ کو بھی خلفاء وقت ہی شہید کرتے ہیں اگر نسل رسولؐ کے قاتل غیر مسلم ہوتے تو بات سمجھ میں آنے کے قابل تھی کہ وہ رسولؐ سے انتقام کا نتیجہ تھا مگر رسولؐ کے نام پر دنیا میں حکومت کرنے والے اور آخرت میں آپ ہی

کی شفاعت پر جنت کی تمنا کرنے والے خلفاء اسلام یعنی شاہان بنی امیہ و بنی عباس بجائے نسل رسولؐ سے محبت کرنے کے اس پاک و باکمال نسل کے قاتل بنے آخر اس کی کیا وجہ ہے؟ یہ ایک ایسا سوال ہے جو تاریخ اسلام کا مطالعہ کرنے والے ذہن کے لیے عظیم اضطراب کا سبب ہے، لیکن اگر واقعات کے تسلسل پر نظر رکھی جائے تو اس سوال کا جواب باآسانی مل جاتا ہے۔ آپ کو یاد ہوگا کہ آنحضرت کی وفات کے بعد جو حکومت حضرت عمر کی بیعت اور حضرت ابوبکر کی خلافت سے شروع ہوئی وہی حکومت حضرت عثمان تک پہنچ کر معاویہ کی طرف منتقل ہوئی۔ یہی حکومت معاویہ کے گھر سے مروان کی نسل میں جا پہنچی اور اسی حکومت پر لالچی بنی عباس نام حسینؑ پر انقلابی تحریک چلا کر قابض ہوئے۔ صدیوں تک مختلف برنگ و نسل و خاندان میں منتقل ہونے والی یہ حکومت اپنے مقاصد اور طریقۂ کار میں یک رنگ تھی جس کا آج تاریخی ثبوت یہ ہے کہ عقیدت مند ہیں اگر کسی دور میں حکومت نے اپنا رنگ و روپ بدلا ہوتا تو عقیدت میں بھی کہیں درار پیدا ہوتی خلفاء ثلاثہ و خلفائے بنی امیہ و بنی عباس کے اتحاد نظر کی دوسری واضح دلیل ان میں سے ہر ایک کے دور میں تسلسل کے ساتھ اولاد رسول کا قتل عام و نسل کشی اور ائمہؑ اہلبیتؑ کا یکے بعد دیگرے انہیں خلفاء کے ہاتھوں شہید ہونا ہے۔

جہاں مذکورہ بالا تسلسل شہادت سے خلفاء کی یک رنگی کا ثبوت ملتا ہے وہاں ائمہ اہلبیتؑ کے کردار کی یکسانیت کی شہادت بھی ملتی ہے۔ اگر کسی امام کی روش اپنے سابق امام کی روش سے الگ ہو جاتی تو یقیناً دشمن حکومتوں کی روش میں بھی تبدیلی آتی یہ بات بھی خود بخود واضح ہو جاتی ہے کہ اگر ائمہ اطہارؑ میں سے کوئی اثر و شخصیت و کردار میں اپنے پیشتر و بزرگوں سے ہلکا ہو جاتا تو دشمن کی گرانی میں بھی کمی آجاتی لیکن ائمہ اور خلفاء

کے درمیان ہونے والی خوں آشام کش مکش کا یکساں ایک انداز اور ایک پیمانے پر چلنا بتاتا ہے کہ نام اور عہد کے فرق کے باوجود سب محمد تھے سب علیؑ تھے سب حسنؑ تھے اور سب حسینؑ تھے اور ان کے قاتل بھی نام و نسل و عہد کے فرق کے باوجود سب یزید تھے سب مروان تھے، سب ہارون و مامون تھے اور سب ملوکیت بنام خلافت کے آسمان کے فاروقی ''مہر و ماہ'' تھے۔

غرض کہ مدینہ سے دمشق وقرطبہ و غرناطہ اور بغداد تک منتقل ہونے والی حکومت وہی تھے جسے حضرت عمر نے سقیفہ بنی ساعدہ ''شریف'' میں قائم کیا تھا اور اس حکومت کی بنیاد ''تمنائے موت محمدؐ'' تھی ظاہر ہے ''تمنائے موت محمدؐ'' سے جنم پانے والی حکومت اپنے کسی دور اقتدار میں بھی کسی بھی ''محمد وقت'' کو زندہ دیکھنا گوارہ نہیں کرسکتی تھی کیونکہ کسی محمدؐ کی بھی بڑھتی پھیلتی نورانی ہر ''خلیفہ وقت'' کی حکومتی زندگی کے لئے اسی طرح خاموش پیام اجل تھی جس طرح شمع کی بڑھتی روشنی اپنے حلقۂ نور میں تاریکی کو خود بخود موت کی گود میں سلادیتی ہے چنانچہ ''تحفظ تاریکی'' کے تدابیر یہی ہیں کہ شمع بجھادی جائے مقید کر دی جائے، جلاوطن کردی جائے اور اس کے نوارانی اثر و نفوذ کو نظر بند کردیا جائے بعینہ یہی سلوک ہر خلیفۂ وقت ہر امام وقت کے ساتھ کرتا رہا اور یہی کشمکش موقع پاتے ہی ہر ''امام وقت'' کا ''خلیفۂ وقت'' کو قاتل بناتی رہی تاریخ کو فلسفہ و تاریخ کے بجائے واقعہ خوانی کے انداز پڑھنے والے اس فریب تاریخی میں مبتلا ہو سکتے ہیں کہ کشمکش امام علی رضا اور مامون کے درمیان ہے مخالفت منصور اور امام جعفر صادق کے درمیان ہے جنگ یزید لعنۃ اللہ و امام حسینؑ کے دریان ہے اور سرد و اعصابی جنگ خلفاء ۸ ثلاثہ اور حضرت علیؑ کے درمیان ہے لیکن فلسفۂ تاریخ کو آنکھوں سے تاریخ کے پڑھنے والے جب اسباب و

نتائج کی کڑیاں ملا کر پڑھتے ہیں تو انھیں وفات رسولؐ کے بعد پیدا ہونے والی دو تاریخیں نظر آتی ہیں جن میں ایک تاریخ حکومت ہیں جن میں ایک تاریخ حکومت ہے اور تاریخ امامت۔

تاریخ حکومت کے ہاتھ میں ہمشیہ تلوار نظر آتی ہے اور تاریخ امامت کے شہ رگ سے زندگی کا خون ہمشہ ٹپکتا دکھائی دیتا ہے اور ہر پیکر امامت کی ہر رگ سے اس خون کا کھینچنے والا ہاتھ حکومت کا ہاتھ دکھائی دیتا ہے اور اس ہاتھ میں خنجر بھی ہے، زہر بھی ہے ،طوق وزنجیر بھی ہے، زہر یلے انگور بھی ہیں اور آدم خور بھوکے درندے بھی ہیں ''لیکن ایک راہ'' اسلام میں اس ''دوراہے'' کے پیدا کرنے والے حضرت عمر ہیں ،ائمہ اہلبیت آنحضرت کے زمانہ میں بھی اور حضورؐ کے بعد بھی اسلام کی راہ پر چلے جئے اور مرمٹے مگر راہ پیغمبرؐ بدلنے نہ دی ''ایک ڈال تاریخ ہے جسے نہ حکومتیں موڑسکیں نہ انقلاب توڑ سکے لیکن حضرت عمر نے عہد پیغمبرؐ میں ''زمین دوز'' جماعت بنائی تھی وہ اپنی سیاست کی سرنگ سے واقعہ قرطاس کے وقت باہر آئی اور اس حضورؐ سے الگ اپنی راہ اپنائی اور اس جماعت کے سات سو سالہ پر اقتدار وحکومت تاریخ جو اپنے ساتھ فتوحات غنیمت بھی رکھتی ہے اس پوری تاریخ کا منشور تھا۔

''ہدایت ہذیان ہے اور اقتدار جس طرح بھی حاصل ہو آسمانی وحی ہے'' اور اس منشور فاروقی پر پوری جماعت حکومت نے بغیر کسی شک کے جم کر عمل کیا۔حضرت عمر نے اپنی ہذیانی مخالفت کی سولی پر اپنے خیال میں حضورؐ کے اسلام اور آپ کی کوشش ہدایت کو سولی دیدی تھی مگر روح اللہ عیسیٰ کے خدا نے ائمہ اہلبیتؑ کی قربانیوں کے ذریعے اسلام اور اس کے پیغام ہدایت کو حفاظت کے چرخ چہارم پر اٹھا لیا اور ایک مدت کے

لئے زمین ظلم سے پُر ہونے کے خالی کردی گئی لیکن وہ وقت آئے گا جب عیسیٰؑ بھی اتریں گے اور محمدؐ کا وارث بھی آئے گا۔اور اسلام اپنا نظام عدل بھی لائے گا۔زمین عدل سے بھر جائے گی ظلم اپنے اعمال کی قبروں میں دفن ہوجائے گا اور ان اعمال کی بے حساب مٹی کے نیچے حضرت عمر کی کراہ سنائی دے گی جسے عدل کے کان سنیں گے لیکن حساب حشر کے دن ہوگا جہاں حضور بھی ہوں گے اور دوسری طرف حضرت عمر ہوں جن کے مخالفت تحریر پیغمبر کے وسیع وعریض شانوں پر خلفاء بنی امیہ وبنی عباس اپنے کاندھوں پر گناہوں کا بوجھ لیے کھڑے ہوں گے۔

(۹)

معلوم ہوا واقعۂ قرطاس مقامی اور وقتی سانحہ نہیں بلکہ اس کے دوررس نتائج واثرات پوری تاریخ اسلام پر حاوی ہیں اور آج بھی اتحاد بین المسلمین کے درمیان یہی واقعہ حائل وفاصل ہے۔اسی واقعہ کے ہاتھوں تاریخ اسلام کے مظلوم ہوئے اور اسی واقعہ نے تاریخ اسلام کے ظالموں کے ہاتھ میں تلوار دی آج بھی اس واقعہ سے بیدردی سے بہائے جانے والے انسانی خون کی بو آتی ہے لہٰذا اس واقعہ پر بہت کچھ لکھے جانے کے باوجود ہمیشہ بہت کچھ لکھے جانے کی ضرورت ہے کاش عقیدت کی گود میں غفلت کی گہری نیند میں سونے والی مسلمان آنکھیں جاگیں، چونکیں اور اپنے گردوپیش کو پہچانیں تاکہ حضورؐ کی حسرت بن جانے والی آرزو پوری ہوسکے۔اس واقعہ کے متعلق کچھ لکھنے والا صرف ایک کتاب نہیں لکھتا ہے بلکہ مظلوم مرسلؐ اعظم کی مدد کرتا ہے مبارک ہیں وہ افراد جو اپنی قلمی کاوش کے ذریعے، انصار رسولؐ، کی صف میں کھڑے ہو رہے ہیں۔خدا کی

رحمت ہو اور حضورؐ کی نظر کرم رہے میرے بھائی مولانا سید کرار حسین صاحب قبلہ واعظ
مدرسۃ الواعظین لکھنؤ پر جو زبان وقلم کے میدان میں ''کرار'' اور دشمنان رسولؐ وآل
رسولؐ کے مقابلے میں ''غیر فرار'' اور بحکم خدا، نبی وآل نبیؐ کے محبّ ہیں خدا ان کو بارگاہ
معصومین میں محبوب قرار دے۔ زیر نظر رسالہ ''سازش'' آپ کے سامنے ہے اس کی
خوبیاں پڑھنے پر آپ کو خود معلوم ہو جائیں گے اسی لیے میں اپنے ''مشک'' کا ''عطار''
نہیں بننا چاہتا۔ بلکہ اپنے جذبات کو صرف تعریف کرنے کے بجائے مصروف دعا رکھنا
چاہتا ہوں خدا ان کو اور مجھے مرتے دم تک نصرت وخدمت کے جذبہ سے سرشار رکھے۔

مقدمہ تنویر الشہادتین

جناب شاہ عبدالعزیز دہلوی ہر مکتبۂ خیال کے حضرات اہل سنت میں بلاتفریق
مقبول ہیں اور آپ کا شمار اسلامی ہند کے صف اول کے علماء میں ہوتا ہے۔ آپ کی مشہور
ترین تصنیف ''تحفۂ اثنا عشریہ'' ہے جو مذہب شیعہ اثنا عشری کی رد میں لکھی گئی ہے۔

زیر نظر رسالہ ''سر الشہادتین'' آپ کی قابل قدر تصنیف ہے جو آپ نے اپنے
معتقدات کے مطابق لکھی ہے جس کے ہر جز سے ہم کو اتفاق نہیں ہے۔ آپ نے اس
رسالہ میں امام حسنؑ وامام حسینؑ کی شہادت کو جناب رسالتمآبؐ کی شہادت ثابت فرمایا
ہے۔ جناب امام حسن علیہ السلام کی شہادت کا مجمل تذکرہ ہے۔ رسالہ کے زیادہ حصہ میں
حسینی شہادت کا بیان ہے ''صلح حسنؑ'' پر عموماً کم اظہار خیال کیا گیا ہے حالانکہ وہ اپنے
اسباب اور عظیم الشان نتائج کی بنا پر غور وفکر کی اس سے کہیں زیادہ مستحق ہے جتنا غور اس پر
اب تک ہوا ہے۔

حسنین علیہم السلام کی شہادت جب شہادت رسولؐ ہے تو ان کی صلح وجنگ
آنحضرتؐ کی صلح وجنگ قرار پائے گی۔ ان کا دوست آپ کا دوست اور ان کا دشمن آپ کا
دشمن ہوگا خواہ دوست یا دشمن ان حضرات کے زمانہ میں رہے ہوں یا بعد میں پیدا ہوں
جیسا کہ آنحضرتؐ نے خود ارشاد فرمایا ہے: مسلمان اس عقیدہ کے بعد ان سے دشمنی کو کفر
اور دوستی کو ایمان سمجھتے ہیں ان کا ذکر غم ماتم ان پر گریہ ونوحہ رسولؐ کا ذکر، غم، ماتم ہوگا اور

رسولؐ پر گریہ ونوحہ ہوگا۔

حسینؑ کی شہادت جب شہادت رسولؐ ہے تو یزید نے حسینؑ کو قتل نہیں کیا بلکہ رسولؐ کو شہید کیا۔ حسینؑ سے مطالبۂ بیعت نہ تھا بلکہ رسولؐ سے مطالبۂ بیعت تھا حسینؑ سے جنگ نہ تھی بلکہ رسولؐ سے جنگ تھی۔ چنانچہ یزید خود فخر کرتا ہے کہ میں نے حسینؑ سے رسولؐ کا بدلہ لیا ہے۔

میں اولاد خندف سے نہ ہوتا اگر میں اولاد احمد سے بدلہ نہ لیتا ان باتوں کا جو (آنحضرتؐ) کر چکے تھے۔

(مقتل ابی مخنف ص/۵۹، مطبوعہ بمبئی ۱۳۱۱ھ، ینابیع المودۃ باب/۶۰، ص/۲۷۶، مطبوعہ بمبئی ۱۳۱۱ھ)

ہر مسلمان کے عقیدے میں آنحضرتؐ سے لڑنے والا کافر ہے لہٰذا یزید میں کسی مسلمان کو شک نہ ہونا چاہئے بلکہ سب سے آسان فیصلہ یزید کے بارے میں خود اس کے اس شعر سے ہو جاتا ہے جس میں اس نے کھلم کھلا اسلام کا انکار کیا ہے۔

بنی ہاشم (یعنی آنحضرتؐ اور ان کے قبیلہ) نے حکومت حاصل کرنے کے لیے اسلام کا ڈھونگ رچایا تھا ورنہ خدا کی طرف سے نہ کوئی پیغام آتا تھا اور نہ آپ پر وحی آتی تھی۔ (مقتل ابی مخنف ص/۵۹، مطبوعہ بمبئی)

اگر یہ عقیدہ رکھنے والا مسلمان کہلائے گا تو پھر کوئی بتائے کافر کسے کہیں؟

یہ حقیقت ہے کہ بنی ہاشم یعنی نبیؐ وآل نبیؐ کی حکومتِ دین اسلام کی عملی تفسیر تھی اور اسلام کی ترویج وبقا اسی پر منحصر تھی۔ اسی وجہ سے بانی اسلام نے اس کے قیام کو دین میں سب سے زیادہ اہمیت دی تھی اور اس کے ختم کرنے والوں نے صرف نبیؐ وآل نبیؐ ہی

پر ظلم نہیں کیا بلکہ عالم انسانیت کو اس وقت تک کے لیے مبتلائے مشکلات ومصائب کر دیا جب تک زمین کو عدل سے پُر کرنے والا جگر گوشۂ رحمۃ للعالمینؐ نہ آجائے اسلام در حقیقت انسان کی انفرادی، عائلی، قومی اور عالمی مشکلات کا حل بن کر آیا تھا۔ یہ مقصد حاصل ہو چکا ہوتا اگر حکومت الٰہیہ کو ملوکیت وقیصریت یعنی خلافت اسلامیہ میں نہ بدل دیا گیا ہوتا۔ یزید یعنی عالم انسانیت کا بدترین فرد نہ اسلام کو مانتا تھا، نہ اس کی روح آل محمدؐ کے روحانی اقتدار کو۔ لہٰذا اس خیال میں اسلام کے خاتمہ کی یہی صورت تھی کہ اس نسل کو دنیا سے مٹا دیا جائے۔ اور شہادت کے بعد مقصد میں اپنے کو کامیاب سمجھ کر ''تشہیر فتح حسینؑ'' کر رہا تھا۔ لیکن حالات بدلے اور کیسے نہ بدلتے جب کردار کی عظمتوں کے مالک مصیبت کا پیکر بن کر پورے ملک سے گذرے جب یزید کو اپنی شکست نظر آنے لگی تو نتائج سے بچنے کے لیے اس نے اہلبیتؑ کو رہا کیا ان پر رحم کر کے یا اپنی غلطی پر نادم ہو کر نہیں بلکہ اپنی غلطی پر پردہ ڈالنے اور شکست کے اثرات سے بچنے کے لیے۔ مگر انسان حسینؑ کی طرف کھنچے چلے آرہے تھے اور کربلا کے ''بے گور وکفن'' کی قبر زیارت گاہ بن رہی تھی۔ دل کا سفینۂ آنسوؤں میں چل کر حسینؑ تک پہنچ رہا تھا۔ عاشور کا دن یوم غم بن چکا تھا۔ یہ دن آتا تھا مگر یزید کے خلاف نفرت کے سیلاب کو طوفانی نہ بناتا تھا۔ حکومت نے اس کے توڑ کے لیے بزور طاقت اس دن کو روز عید قرار دیا۔ اسلامی دنیا میں عاشور کے دن ایک ساتھ دو مظاہرے ہو رہے تھے۔ ایک مظاہرۂ غم دوسرا مظاہرۂ مسرت۔ ایک دردمند انسانوں کا مظاہرہ دوسرا بے رحم اموی حکومت کا مظاہرہ۔ یہ سلسلہ برسوں چلتا رہا اور غم حسینؑ کی گرمی میں حکومت کا ظالمانہ دماغ پگھلتا رہا۔ بنی امیہ کی حکومت مٹی مگر بنی امیہ کے ہمدرد اور حامی نہ مٹے۔ حکومت کی طاقت کے بجائے فتوے کی قوت استعمال

ہونے لگی نت نئے فقرے ایجاد ہوئے رنگ برنگ کے فتوے نکلے حسینؑ کے بعد ذکر حسینؑ پر اعتراضات کی تیر بارانی ہوئی۔ حدیثیں گڑھی گئیں۔ احادیث کے مطالب مصلحت کے مطابق وضع کئے گئے۔ کبھی کبھی کسی ''حرملہ طینت'' نے معصوم حسینیتؑ کی مخالفت اور یزید کی کھل کر حمایت کی لیکن حسینؑ آسمان انسانیت پر چھاتے رہے۔ ذکر حسینؑ آنسوؤں میں برستا رہا۔ یزید اور یزیدیت کا خس وخاشاک بہہ کر اپنے ٹھکانے پر پہنچتا رہا۔

کسی نے سچ کہا ہے کہ ''جھوٹ کو سچ بنانے کا ذریعہ یہی ہے کہ مسلسل جھوٹ بولے جاؤ'' یزیدی کی حکومت جو نہ کرسکی وہ یزید کے حامی زبان وقلم نے کیا۔ چنانچہ اسلامی ذہن حسینؑ ویزید کے مسئلہ میں الجھتا رہا۔ آج بھی الجھن باقی ہے۔ اسی مسئلہ کو یکسو کرنے کے لیے جناب شاہ عبدالعزیز دہلوی نے یہ رسالہ تصنیف فرمایا اور اسی ضرورت کے پیش نظر یہ رسالہ پھر سے شائع کیا جارہا ہے حسینیوں کا فرض ہے کہ ذکر حسینؑ کو عام کرتے جائیں اور مطمئن رہیں کیونکہ تاریخ شاہد ہے کہ جتنی حسینؑ کی مخالفت کی جاتی ہے اتنا ہی حسینؑ سے محبت اور یزید سے نفرت کرنے والوں کی تعداد میں اضافہ ہوتا ہے۔ دھندلے نقوش اجاگر ہوجاتے ہیں۔ شہادت تو وہ حنا ہے جو بحث میں جتنی پستی جائے گی اتنا ہی رنگ نکھرتا جائے گا ہم حسینؑ سے کسی کے اختلاف پر ناک بھوں نہیں چڑھاتے بلکہ استقبال کرتے ہیں کیونکہ اس میں ہمارا نفع ہے۔ چٹان کا نقصان نہیں ہوتا مینڈھے کا سر ٹوٹتا ہے اور دیکھنے والوں کو چٹان کے استحکام کا ایک نیا یقین حاصل ہوتا ہے۔ حمایت یزید کی نامحمود کوشش چاہے کوئی اموی کرے یا عباسی وہ خود مجسم ''حیرت'' بن جاتا ہے۔ حسینی تو صبر کے خوگر ہیں۔ صابر کے پرستار ہیں، وہ تعریف وتوصیف یزید کا دکھ بھی جھیل

لیں گے۔ حد ہوگئی کہ یزید کو ان کے دوستوں نے مسلمان ہونے کا دعویٰ کرنے کے باوجود رحمۃ اللہ علیہ، رضی اللہ عنہ، حضرت، لکھا۔ اپنا امام تو بے شک انہیں لکھنے کا حق تھا۔ لیکن رحمت یا خوشنودی خدا ان کی ملکیت نہیں ہے۔ جو وہ یزید کو دینا چاہتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ جو رحمۃ للعالمین کو نہ مانے وہ عالمی کی حد سے باہر ہوجائے تب شاید رحمت پاسکے۔ جو محبوب خدا کو ناراض کرے اس سے کیوں کر خدا راضی ہوگا۔ یزید کے لیے استعمال ہوکر ان الفاظ کی مٹی پلید ہوگئی۔ اب یہ جس کے لیے بھی استعمال ہوں ہم حسینیوں کو کوئی اعتراض نہ ہوگا۔

جان تہذیب واخلاق اسلام نے بیزاری ونفرت کے اظہار کے لیے ایک اصطلاحی لفظ رکھا ہے یعنی ''لعنت'' ہم پرستاران خدا ورسولؐ ہر قاتل حسینؑ پر لعنت بھیجتے ہیں اگر ہم ہی قاتل تھے تو ہم اپنے پر ہی بخوشی عبادت وثواب سمجھ کر لعنت بھیج رہے ہیں۔ بھلا کیوں کسی کو برا لگنے لگا لیکن اگر کوئی برا مانے تو سوچو اس کا سبب مذہبی رشتہ کا اتحاد تو نہیں ہے اور ''قاتلان حسینؑ کے مذہب'' کے ماضی کو اس کے حال سے پہچان لو۔

یزید جب اپنے کو قتل حسینؑ کی ذلت سے بچانا چاہتا ہے تو کہتا ہے لعن اللہ ابن مرجانہ۔ (الحسینؑ تالیف علی جلال الحسینی، مطبوعہ مصر ص/۱۳۴)

خدا ابن زیادہ پر لعنت کرے جس نے حسینؑ کو قتل کیا۔ قاتل حسینؑ یزید کی نظر میں بھی قابل لعنت ہے۔ جو قاتل حسینؑ پر لعنت کو حرام کہتے ہیں وہ سوچیں کہ اب ان کا موقف کیا ہوگا۔ رہی یزید کی یہ بات کہ میں قاتل نہیں بلکہ ابن زیادہ قاتل ہے یہ وہ ''سفید سچ'' ہے جس کی تصدیق اس کا وہ خط کررہا ہے جو اس نے حاکم مدینہ کو لکھا تھا کہ حسینؑ سے بیعت لو یا ان کا سر بھیج دو۔ (ینابیع المودۃ ص/۲۷۷، مطبوعہ بمبئی)

اس کی سچائی کے گواہ یزید کے وہ سپاہی ہیں جو حاجیوں کے لباس میں قتل امامؑ کے لیے مکہ بھیجے گئے تھے۔ (ینابیع المودۃ ص ر ۲۸۰، مطبوعہ بمبئی)

مزید تصدیق مطلوب ہوتا اس حکم نامۂ یزید کو دیکھو جو ابن زیادہ کے پاس ملے گا جس میں سائے ''سفیر حسینی'' جناب مسلم ابن عقیل کے اثرات کو مٹانے اور کربلا کی مہم کے سرکرنے کے لیے کوفہ کا حاکم مقرر کیا تھا۔ (ینابیع المودۃ ص ر ۲۷۹،)

اور بھی بہت سے یزید کی سچائی کے سچے گواہ ہیں جن میں سرفہرست شمر وغیرہ کا نام ہے اور تصدیق کے لیے وہ انعامات ہیں جو ان کو قتل امامؑ پر ان کے ''امیر المومنین'' یزید سے ملے تھے۔ البتہ ایک بات یزید اس فقرہ کے ساتھ کہنا بھول گیا اور ابھی تک کسی حامی یزید کو بھی یاد نہ آئی کہ (**لست من خندف ان لم انتقم. من بنی احمد ما کان فعل**) بھی ابن زیادہ کا شعر ہے جو اس نے دمشق میں قصر یزید میں بیٹھ کر دربار کے مجمع میں بہ کرامت بجائے حاکم کوفہ ہونے کے یزید کا روپ دھار کر پڑھا تھا اگر یہ بات کہی جائے تو ہم اس کی تصدیق کریں گے کیونکہ تاریخ بنی امیہ کی عفت مآب خاتون ''سمیہ'' کے بدولت ابن زیادہ بھی لست من خندف کہنے کا اسی طرح حق دار ہے جس طرح یزید۔ یقین نہ آئے تو مریم خمار سے پوچھ لو۔ (مروج الذہب مسعودی برحاشیہ کامل ج ر ۶، ص ر ۶۹، مطبوعہ مصر ۱۳۰۳ھ)

جہاں جلوس غم میں باجہ کھیل کود، زرق برق لباس یزید کے قائم کردہ جشن مسرت کے ذریعہ داخل ہوگئے وہاں حسینؑ پر بغاوت، بے جا ضد وغیرہ اعتراضات غیر نہیں بلکہ مسلمان کرنے لگے اور ذکر حسینؑ پر بندش اگر کبھی لگی تو وہ بھی مسلمان اور صرف مسلمان کے ہاتھوں مشاہدات کی دنیا میں یہ عجیب اور انوکھی حالت دیکھنے میں آئی کہ مسلم

اور غیر مسلم، مذہبی اور غیر مذہبی بلکہ منکر خدا اور سولؐ افراد بلا تفریق مذاہب و نظریات حسینؑ کی حمایت اور یزید سے نفرت کرتے ہیں لیکن حسینؑ کا مخالف اور یزید کا حامی اگر کہیں کوئی نکلا تو مسلمان۔ جس کی وجہ یہی ہے کہ حسینؑ سے ٹکرانے والا بھی ایک نام نہاد مسلمان تھا۔ آج بھی یزید کا حامی اس کا کوئی ہم مشرب مسلمان ہی ہوگا۔ ہم حمایت یزید سے کسی کو منع نہیں کرتے لیکن اتنا ضرور عرض کرنا چاہتے ہیں کہ جب یزید اپنی زندگی وحکومت میں حسینیت کو نقصان نہ پہنچا سکا تو آج مردہ یزید کا تذکرہ کیوں کر زندۂ جاوید حسینؑ کے ذکر کو نقصان پہنچا سکے گا۔

ہرگز نمیرد آنکہ دلش زندہ شد بعشق
ثبت است برجریدۂ عالم دوام ما

حسینؑ پر الزام بغاوت ہے اور لوگوں کو معلوم نہیں کہ حسینؑ کی مقبولیت کا راز یہی ہے کہ انہوں نے یزید کی مخالفت کی۔ حسینؑ باطل کے باغی نہ ہوتے تو کیا حق سے بغاوت کرتے؟ ہمیں حسینؑ کی یزید سے بغاوت تسلیم ہے مگر اس کے شکوہ کے ساتھ کہ لفظ بغاوت کا یہ استعمال لغت پر ظلم ہے۔ بغاوت حق سے ہوتی ہے نہ کہ باطل سے یہ استعمال ایسا ہی ہے جیسے فرعون سے اپنا ایمان چھپانے والے جناب حزقیل کو ہم منافق کہنے لگیں۔ جن کو قرآن ''مرد مومن'' کہتا ہے۔ پھر باغی اسے کہا جاسکتا ہے جو مان کر انکار کرے لیکن جو ہمیشہ انکار کرتا رہا ہو اس نے کب مانا تھا۔ جواب نہ ماننے کو بغاوت کہا جائے گا۔

امامؑ پر اعتراض ہے کہ جب واقعہ شہادت کی اطلاع رکھتے تھے تو کربلا کی طرف تشریف کیوں لے گئے اس سوال کی طرح یہ بھی پوچھا جاسکتا ہے کہ جب خدا جانتا

تھا تو ابلیس کو کیوں پیدا کیا۔ معلوم ہوا علم باطن اور اسباب ظاہر کے نتیجے کو ایک دوسرے
سے جوڑنا غلط ہے خدا نے ابلیس کو سرکشی کے لیے نہیں پیدا کیا اور نہ شیطان معصیت پر
مجبور تھا۔ چنانچہ جتنے دن وہ آسمان پر رہا عابد تھا۔ مطیع تھا، اللہ نے اس کو جو قوتیں دی تھیں
ان کا مصرف وہ زندگی تھی جو اس نے سجدۂ جناب آدمؑ کے واقعہ سے قبل آسمان پر ملائکہ
کے ساتھ بسر کی تھی اس کے بعد اس کا لعین ورجیم ہو جانا خود اس کے غلط طرز عمل کا نتیجہ
تھا۔ اسی طرح امامؑ نے تحفظ کی کسی کوشش کو مکمل کیے بغیر نہ چھوڑا۔ مدینہ میں خطرہ پا کر مکہ
چلے گئے۔ مکہ میں جب خطرہ کا احساس ہوا کوفہ کی طرف روانہ ہوئے۔ کوفہ منقلب ہو گیا
تو آپ دوسری جگہ جانا چاہتے تھے مگر لشکر یزید نے گھیرا ڈال دیا آپ گفتگوئے صلح
فرماتے رہے۔ صلح کی گفتگو آپ نے نہیں ابن زیاد نے ختم کی، حملہ آپ نے نہیں پسر سعد
کے لشکر نے کیا۔ امام پر اعتراض تب ہو سکتا جب یہ بتایا جائے کہ اگر فلاں صورت اختیار
کرتے تو محفوظ رہتے اور آپ نے اس صورت کو اختیار نہ کیا ہو۔ رہا بیعت کر کے زندہ
رہنا تو کوئی مسلمان اس زندگی پر آج راضی نہیں تو حسینؑ کل کیونکر راضی ہو جاتے۔
اسباب ظاہر کے اعتبار سے آپ جنگ کے دن بھی آخر تک کوشش فرماتے رہے کہ آپ
کے خون سے مسلمان ہاتھ نہ رنگیں۔ آپ کی تقریروں کا اثر نہ ہوا۔ یہ اثر نہ لینے والوں کا
فعل تھا۔ یہ خیال کہ ان حالات میں اثر پیدا ہونے کی امید کرنا خلاف عقل تھا سوائے حر
اور ان کے بیٹے بھائی غلام نے حسینؑ کے قدموں میں آ کر اور جان دے کر غلط ثابت
کر دیا۔ اس مسئلہ میں اپنے اپنے نقطۂ نظر کا فرق ہے کسی کو اعتراض ہے کہ جانتے تھے تو
گئے کیوں؟ اور ہم اسی بات پر ان کو مانتے ہیں کہ جانتے ہوئے موت کی طرف سے
اطمینان سے گئے۔ معترض ان کو ماننا چاہتا ہے جو موت کو دیکھ کر بھاگیں اپنے کو بچانے

کے لیے ہم ان کو ماننا چاہتے ہیں جو موت پر اس طرح جا پڑیں کہ موت خود ڈر کر پیچھے ہٹ
جائے۔ موت حسینؑ سے کس قدر خوفزدہ تھی اسے یوں دیکھو کہ وہ موت جو ایک تیر کے
ذریعہ صبح عاشورہ کو حسینؑ تک پہنچ سکتی تھی اسے پسر سعد کی کم از کم ۲۰ ہزار فوج کے ۴۰ ہزار
ہاتھ حسینؑ کی طرف ڈھکیلتے ہیں تب بھی وہ دس گھنٹے میں عصر عاشور کو حسینؑ تک پہنچی ہے۔

شہادت حسینؑ کے سلسلہ میں بدترین فقرہ جو کہا گیا وہ یہ تھا ان الحسینؑ قتل
بسیف جدہ۔ حسین اپنے نانا کی تلوار سے قتل ہوئے۔ رسولؐ کہتے ہیں کہ حسین منی وانا
منہ۔ (صواعق محرقہ ص ۱۱۴)

ہم اور حسینؑ ایک ہیں۔ لہٰذا حسینؑ کی شہادت رسول کی شہادت ہے، اور کہنے
والا کہتا ہے حسینؑ کو رسولؐ کی تلوار نے قتل کیا یعنی یزید سیف الرسول تھا۔ دونوں باتوں کا
یہی نتیجہ نکلا کہ رسولؐ نے اپنے کو اپنے ہاتھوں قتل کیا۔ معلوم ہوا حسینؑ پر اعتراض نہیں ہے
بلکہ رسولؐ پر الزام خودکشی ہے۔ مسلمان اگر فقرہ کی ساخت پر غور کرے تو اسے معلوم ہوگا
کہ کہنے والا کسے قاتل حسینؑ کہہ رہا ہے۔ اس فقرہ کی ترکیب اس طرح ہے کہ نہ رسولؐ
امت کو اپنا حاکم بنانے کا اختیار دیتے نہ یزید لوگوں کے ذریعہ حاکم بنتا نہ حسینؑ قتل ہوتے
یعنی قاتلِ حسینؑ صرف شمر، پسر سعد، ابن زیادہ اور یزید نہیں ہیں بلکہ جس نے یزید کو
حکومت تک پہنچانے میں مدد کی وہ سب قاتل حسینؑ ہیں۔ نہ صرف یہ لوگ بلکہ وہ بھی
جنھوں نے انتخاب خلافت کا اصول بنایا۔ اور اصل قاتل انتخاب خلافت کا اصول ہے۔

حسینؑ و یزید کی بحث پر بطور حرف آخر ہم شاہ محمد حسن پھلواری شریف کی کتاب
''شہادت حسینؑ'' کی حسب ذیل عبادت نقل کرتے ہیں۔ موصوف ایک حنفی المذہب سنی
بزرگ عالم ہیں۔

''اگر واقعی یہ تاریخ وسیر غلط ہیں اور ذہبی، واقدی ابن حجر سیوطی، ابن سیرین، ابن کثیر، ابن خلکان، اور دیگر تمام محققین وعلمائے اہل سنت یزید پر بہتان کرتے ہیں جو اسے ایسا بتاتے ہیں، بلکہ اس کے حالات پر پردہ پڑا ہوا ہے اور یزید درحقیقت بہت ہی پارسا گزیدہ خدا رسیدہ ومتقی اور بزرگ تھا تو بہت بہتر ہے خدا آپ کا (مرزا حیرت دہلوی کا) حساب یزید ابن معایہ کے ساتھ کرے اور ہم لوگوں کا حشر سبط رسولؐ سید الشہداء، سید شباب اہل الجنۃ جناب امام حسینؑ کے ساتھ۔

جس کا جی چاہے ہو یزید کے ساتھ
ہم ہیں اور دامن امام حسینؑ

مزید اطمینان کے لیے ہم یزید کے فرزند معاویہ کے خیالات درج کرتے ہیں۔

''معاویہ یزید کے بعد اپنے باپ کی جگہ پر بادشاہ ہوا اس سے زیادہ معتبر شخص کون ملے گا۔'' (صواعق محرقہ ص/۱۳۴ ام میمینہ مصر ۱۳۱۲ھ)

یزید کا بیٹا معاویہ اپنے باپ کے بعد بادشاہ ہوا اس نے منبر پر آکر حسب ذیل تقریر کی یہ خلافت اللہ تعالیٰ کی رسی ہے۔ میرے دادا معاویہ نے خلافت کے لیے علی ابن ابی طالبؑ سے جنگ کی حالانکہ علیؑ خلافت کے اہل تھے۔ اور میرے دادا سے زیادہ اس کے حق دار تھے تم جانتے ہو کہ کس طرح وہ تم پر مسلط رہے یہاں تک کہ ان کی موت نے ان کو آدبوچا اور اب قبر میں وہ اپنے گناہوں کی سزا میں گرفتار ہیں۔ ان کے بعد میرے باپ خلافت پر قابض ہوئے۔ وہ بھی اس کے اہل نہ تھے اور انہوں نے رسول اللہؐ کے نواسے سے جنگ کی جس کے باعث ان کی عمر کم ہوگئی اور نسل منقطع ہوگئی آج وہ اپنی قبر

میں گناہ کی سزا بھگت رہے ہیں فرزند یزید اس کے بعد روتے رہے پھر کہا ہمارے دل پر بہت گراں ہے۔ الم کہ ہمارے باپ کی موت بہت بری ہوئی اور اللہ کے سامنے اس کی بازگشت بھی بری ہوگی کیونکہ انہوں نے رسول اللہ کی عترت کو قتل کیا شراب کو جائز اور خانۂ کعبہ کو برباد کیا پھر بھی ان کو خلافت کی شیرینی نصیب نہ ہوسکی لہٰذا میں اس کڑوے گھونٹ کو اپنے حلق سے اتارنے پر تیار نہیں ہوں۔ تم جانو اور تمہارا کام جانے۔ خدا کی قسم اگر دنیا میں بھلائی ہے تو ہم اس میں سے اپنا حصہ پا چکے اور اگر برائی ہے تو اولاد ابوسفیان کے حصہ میں جتنی برائی آچکی وہ کافی ہے۔ اس تقریر کے بعد معاویہ بن یزید گھر میں بیٹھ رہا اور چالیس دن کے بعد مر گیا۔''

ذکر حسینؑ کو قابل نفرت بنانے کی سعی میں کہا گیا:

''واعظ پر ذکر حرام ہے کیونکہ یہ ذکر صحابہ سے بغض پیدا کرتا ہے۔'' (صواعق محرقہ، ص/۱۳۳، مطبوعہ مصر ۱۳۱۲ھ)

صحابہ کا عقیدت مند مسلمان اس فقرہ سے متاثر ہوجاتا ہے لیکن اسے سوچنا چاہئے کہ صحابہ حسینؑ کے ساتھی ہیں یزید کے۔ اگر یزید کے ساتھی ہیں تو یقیناً ذکر حسینؑ ان سے نفرت پیدا کرے گا۔ جس طرح اس ذکر کے باعث یزید سے نفرت پیدا ہوتی ہے لیکن صحابہ اگر حسینؑ کے ساتھی ہیں تو ذکر حسینؑ ان سے کیوں نفرت پیدا کرنے لگا۔ اس فتوے کے دینے والے نے حسینؑ کے ذکر کو بدنام نہیں کیا بلکہ صحابہ کو یزید کا ساتھی بنا کر بدنام کیا۔

گریہ کو حرام کہا گیا جس کی تائید میں حدیث بیان ہوئی کہ لوگوں کے رونے سے میت پر عذاب ہوتا ہے۔ سوچنا چاہئے خدائے عادل کیونکر رونے والوں کی سزا میت

کودے گا کیا یہ ظلم صریح نہ ہوگا تعالیٰ اللہ عما یقولون۔

یہ کہہ کر ''شہید زندہ ہے گریہ مردہ پر ہوتا ہے ہم حسینؑ کر مردہ مانیں تو روئیں جو روتے ہیں وہ مردہ سمجھتے ہیں۔'' گریہ سے روکنا چاہا مگر ہم اقبال سہیل کے شعر کو مانیں۔

روئیں وہ جو قائل ہیں مماتِ شہدا کے

ہم زندۂ جاوید کا ماتم نہیں کرتے

یا جناب یعقوب کی سنت کو اپنائیں جو زندہ یوسفؑ کے فراق میں روتے روتے اپنی آنکھیں سفید کر لیتے ہیں۔ اگر شہید کا ماتم نہیں ہوتا تو رسولؐ نے جناب حمزہ شہید احد کے ماتم کرنے والوں کو دعا کیوں دی۔ (ینابیع المودۃ ج ۲، ص ۲۸۸، مطبوعہ نول کشور کانپور)

آنحضرتؐ قبل واقعہ کربلا حسینؑ پر روئے، پھر خواب میں آپ ماتمی صورت سے قتل حسینؑ کے دن جناب عباس اور جناب ام سلمہ کو نظر آئے جیسا کہ زیر نظر رسالہ میں آپ کو ملے گا۔ جس کے بعد گریہ کو بدعت کہنا نبی کے طرز عمل کو بدعت کہنا ہوگا۔ مزید تسلی خاطر کے لیے ذیل کی روایتیں نقل کی جاتی ہیں۔

(۱) حسینؑ پر رونے والا اولوالعزم رسولؐ کا ساتھی اور قیامت میں نور کا مالک ہوگا۔

''عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال ومامن عبد یبکی یوم اصیب ولدی الحسین الاکان یوم القیامۃ مع اولی العزم من الرسل وقال البکاء فی یوم عاشورا نور تام یوم القیامۃ۔ (اصابہ فی تمیز الصحابہ ج ۱، ص ۵۳۳، مطبوعہ مصر، ۱۳۲۸ھ)

''پیغمبر نے ارشاد فرمایا جو شخص بھی حسینؑ پر ان کی شہادت کے دن روئے گا وہ

قیامت کے دن اولوالعزم رسولوں کے ساتھ ہوتا اور عاشور کے دن کا گریہ قیامت کے روز نور بن کر کام کرے گا۔

(۲) جو حسینؑ پر ایک آنسو بھی روئے اس کی جگہ جنت ہے۔

''فی مسند احمد بن حنبل من دمعت عیناہ لقتل الحسینؑ دمعۃ وقطرت بواہ الجنۃ۔'' (وسیلۃ النجاۃ ملا مبین فرنگی محلی ترجمہ ہادی علی خاں۔ مطبوعہ گلشن فیض لکھنؤ ۱۸۹۱ء، ۱۳۱۳ھ، ص ۲۰۵)

مسند بن حنبل میں یہ حدیث ہے کہ غم حسینؑ میں جس کی آنکھیں ڈبڈبا آئیں اور آنسو بہہ نکلیں اس کی جگہ جنت ہے۔

(۳) جناب شیخ عبدالقادر جیلانی اپنی کتاب غنیۃ الطالبین کی دوسری جلد کے ص ۶۲ مطبوعہ مصر ۱۳۳۲ پر لکھتے ہیں۔

''قال ھبط علی قبر الحسین بن علی رضی اللہ عنہما یوم اصیب سبعون الف ملک یبکون علیا، الی یوم القیامۃ۔''

قبر حسین ابن علی رضی اللہ عنہما پر آپ کی شہادت کے دن ستر ہزار ملائکہ اترے جو قیامت تک آپ کی قبر پر روتے رہیں گے۔

ملک آسمان پر عبادت الٰہی میں مصروف تھے اگر حسینؑ پر گریہ ان عبادتوں سے بلند درجہ عبادت نہ ہوتی تو یہ وہاں سے گریہ کرنے یہاں نہ آتے۔

قیامت تک رونا بتلاتا ہے کہ حسینؑ پر گریہ کے سلسلہ کو خدا قیامت تک باقی رکھنا چاہتا ہے۔

ملک آسمان پر بھی رو سکتے تھے لیکن قبر حسینؑ پر آ کر رونا بتاتا ہے کہ زیارت قبر بھی

عبادت ہے جو آسمان پر حاصل نہ ہوتی۔

حسینؑ کے ماننے والے جہاں آپ کا غم کرتے ہیں وہاں آپ کو اپنی مدد کے لیے پکارتے ہیں۔آپ کے نام پر نذر و نیاز کرتے ہیں۔آپ کی زیارت کے لیے جاتے ہیں۔سلام کرتے ہیں بعض مسلمان اسے بت پرستی اور مردہ پرستی کہتے ہیں۔اللہ کے علاوہ اگر کسی دوسرے کی تعظیم کرنا بت پرستی ہے تو رسولؐ، قرآن، کعبہ جن کی تعظیم کا حکم خدا نے دیا ہے۔ یہ سب بت پرستی ہوگی۔حالانکہ بت پرستی کے معنی ہیں غیر خدا کو خدا سمجھنا، ظاہر ہے کہ جب ہم حسینؑ کو خدا نہیں مانتے تو تعزیہ وعلم وتابوت کو کیوں کر خدا مانیں گے۔بلکہ حسینؑ کو بھی مانتے ہیں تو صرف خدا کی وجہ سے۔رہا ان کو سلام کرنا ان کی زیارت کرنا وغیرہ تو یہ چیزیں مردہ پرستی تب ہوتیں جب حسینؑ مردہ ہوتے لیکن شہید زندہ جاوید ہے۔ لہٰذا ہم حسینؑ سے وہی روابط رکھتے ہیں جو زندہ انسانوں سے رکھے جاتے ہیں۔سلام وملاقات زندہ سے کی جاتی ہے مدد کے لیے زندہ کو آواز دی جاتی ہے۔نذر وتحفہ زندہ کو پیش کیا جاتا ہے۔البتہ جو ان چیزوں کو مردہ پرستی جانتے ہیں وہ حسینؑ کو مردہ سمجھتے ہیں اور قرآن مجید کی تکذیب کرتے ہیں جو شہید کو زندہ بتلاتا ہے۔یہ سوچنا کہ نذر حسینؑ کے کام نہیں آتی تو اس کا کیا فائدہ پھر یہ بھی سوچو کہ نذر خدا کے کس کام کی جو اس کے نام پر قربانی کی جاتی ہے۔زیر نظر رسالہ میں آپ بکثرت پائیں گے کہ ملائکہ نے ذکر مصائب حسینؑ کیا اور آنحضرتؐ روئے جو جواز مجلس کی دلیل ہے یہ بھی آپ کو ملے گا کہ ملک نے رسولؐ کو اس زمین کی مٹی لا کر دی جہاں حسینؑ شہید ہونے والے تھے آپ اس مٹی کو دیکھ دیکھ کر روتے ہیں۔حفاظت سے رکھنے کے لیے جناب ام سلمہ کے حوالے کرتے ہیں یہ مٹی عاشور کے دن خون ہو جاتی ہے نبی خواب میں آ کر کربلا سے دور مدینہ والوں کو خبر شہادت

دیتے ہیں آپ چہرہ اور ڈاڑھی پر خاک ملے ہوتے ہیں اور ایک شیشہ میں حسینؑ اور دیگر شہداء کا خون جمع کر کے خواب میں اس کی زیارت کراتے ہیں شہادت حسینؑ پر خدا وند عالم کی طرف سے آثار غم پیدا کئے جاتے ہیں۔آسمان روتا ہے زمین روتی ہے۔آپ جب ان تمام باتوں پر غور کریں گے تو محسوس کریں گے کہ غم حسینؑ کا منانا اور اس غم کا پھیلانا اس کے لیے آثار غم پیدا کرنا منشاء خدا اور رسولؐ ہے۔اس غم کو اسی طرح منانا چاہئے جس طرح رسولؐ چہرہ پر خاک مل کر مناتے ہیں نہ کہ زرق برق لباس پہن کر۔

واقعہ کربلا سے پہلے کربلا کی سرزمین کی مٹی سے محبت کرنا اور اسے سونگھنا جب کہ اس میں ابھی خون حسینؑ شامل نہیں ہوا ہے بتاتا ہے کہ نبیؐ کی نظر میں وہ خاک قابل محبت ہے جسے اس زمین سے نسبت ہو جس کو حسینؑ کا مقتل بننا ہے اور اظہار محبت کا ذریعہ اسے سونگھنا ہے تو مسلمان بعد شہادت اس خاک کی تعظیم ومحبت کیونکر نہ کرے گا جب بنیاد محبت نسبت ٹھہری تو حسینؑ سے منسوب ہر چیز قابل محبت ہوگی۔

ایک نیا فلسفہ ایجاد کیا گیا کہ شہادت سے حسینؑ کو بلند درجات ملے اسلام زندہ ہو گیا دین محفوظ ہو گیا یہ تو خوشی کا موقع ہے نہ کہ غم کا اگر واقعی یہ فلسفہ صحیح ہوتا تو رسولؐ جناب حمزہ کی شہادت پر مسرت کا جشن مناتے نہ کہ رونے والوں کی تمنا کرتے اور اصحاب کی عورتوں کے رونے پر ان کے اور ان کی اولاد بلکہ اولاد کی اولاد کو دعا دیتے جس کی تفصیل مناہج النبوۃ میں درج ہے۔

ان فلسفیوں پر عقل روتی ہے جو یہ بھی نہیں سمجھتے کہ کوئی بھی حسینؑ کے فائز بدرجۂ شہادت ہونے پر نہیں روتا بلکہ بسلسلۂ شہادت پیش آنے والے اندوہناک مصائب پر رونے والے روتے ہیں جس طرح وقت شہادت سرور کائنات کے ساتھ

کائنات رو رہی تھی مسلمان کا فرض ہے کہ وہ حضرت ابوبکر کے طرزِ عمل سے سبق حاصل کرے جس کی تفصیل یہ ہے کہ دشمن جب آنحضرتؐ کی تلاش کرتے ہوئے غارِ ثور کے منھ تک آ گئے جہاں آپ مع جناب ابوبکر کے پوشیدہ تھے اس وقت آپ نے رونا شروع کر دیا۔اور آنحضرتؐ کے دریافت فرمانے پر کہا کہ:

''میں اپنی جان کے خوف سے نہیں رویا بلکہ مجھے اس خیال نے رلایا کہ کہیں آپ کو کوئی گزند نہ پہنچ جائے۔''

(ملاحظہ ہو سیرت حلبیہ ج ۲/ص ۴۱، مطبوعہ ازہر مصر)

''ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ قریش کو دیکھ کر رنجیدہ ہوئے اور رونے لگے فرمایا کہ خدا کی قسم میں اپنی جان جانے کے خوف سے نہیں رویا بلکہ میرے رونے کی وجہ یہ خیال تھا کہ کہیں آپ کو کوئی ناگوار واقعہ پیش نہ آئے۔''

اگر حصول شہادت پر غم کے بجائے مسرت ہونا چاہئے تو جناب ابوبکر کو رونا نہ چاہئے تھا بلکہ سجدہ میں گر کر دعا کرنا چاہئے تھی کہ خدا آنحضرتؐ کو اس وقت درجہ شہادت عطا فرمائے۔ جب صرف تصور شہادت پر گریہ صحیح ہے تو انتہائی کرب و بے پناہ مصائب برداشت کر کے شہید ہونے والے حسینؑ پر کیونکر نہ رویا جائے۔

غرض کہ حسینؑ اور غم حسینؑ دونوں کی مخالفت کی جاتی ہے کیونکہ مخالفت کرنے والے جانتے ہیں کہ غم وہ پُر تاثر چیز ہے جس سے زیادہ اثر ڈالنے والی دوسری کوئی چیز اس دنیا میں نہیں پائی جاتی اسی لیے جن مذہب میں واقعی غم انگیز واقعات نہیں ہیں انہوں نے بھی اپنی مذہبی تاریخ میں غم اور اس کے تذکرہ کو شامل کرنا ضروری سمجھا۔ جناب عیسیٰ آج بھی زندہ ہیں مگر ان کی سولی کا غم انگیز واقعہ روزانہ پر درد طریقہ سے بیان ہوتا ہے اور اس

غم کی نشانی آج نشان عیسائیت ہے دوسرے مذاہب بھی اپنے غمگین واقعات کو بیان کرتے ہیں مذہبی جلسے اور جلوس کی بنیاد خاص طور پر یہی واقعات ہوتے ہیں۔غم، انسانی قلب و دماغ کو متاثر کیے بغیر نہیں رہتا۔ یہ ایسی حقیقت ہے جس سے کسی مذہبی اور غیر مذہبی انسان کو انکار نہیں۔فرضی واقعات جو افسانوں اور ناولوں میں لکھے جاتے ہیں ان میں بھی غمگین واقعات کا بیان ہوتا ہے، اور نہ جانتے ہوئے کہ یہ واقعات فرضی ہیں لوگ پڑھ کر روتے ہیں اور مقبولیت کی بنیاد غم کی مصوری ہوتی ہے۔غزل کا محور ''غم جاناں'' ہے عوام کا محبوب لیڈر وہی ہوتا ہے جو ان کے غم میں شریک ہوتا ہے۔

یہ غم ہی کا اثر ہے کہ غیر مسلم بانی اسلامؐ سے اتنا متاثر نہیں جتنا آپ کے نور نظر امام حسینؑ سے متاثر ہے کیونکہ آنحضرتؐ کے واقعات مسرت و غم دونوں پر مشتمل ہیں جبکہ واقعہ کربلا از ابتدا تا انتہا غم ہی غم ہے اور غم بھی بے پناہ جس کی نظیر تاریخ میں نہیں ملتی یہ غم کا زور ہے کہ غیر مسلم اسی حسینؑ کے سامنے جھکتا ہے جس نے اسلام پر جان دی اور اس کو نظریاتی و مذہبی اختلاف حسینؑ کی پر جوش حمایت سے نہیں روک پاتا ہے مگر افسوس کا مقام ہے مسلمانوں کو ان کا اسلام حسینؑ سے روکتا ہے غیروں کو اپنانے کے لیے ذکر حسینؑ ایک عظیم ذریعہ ہے۔ کاش مسلمان اس حقیقت کو سمجھ لیتے اور حمایت و تبلیغ اسلام میں ذکر حسینؑ سے اس کے شایان شان کام لیتے آج حسینؑ ہماری دنیا میں موجود نہیں ہیں جن کو ہم ان کا حق دلائیں گے اور نہ یزید زندہ ہے جس سے ہم انتقام لیں گے اس لیے یہ خیال قطعاً غلط ہوگا کہ اس غم سے حسینؑ کو کوئی فائدہ پہنچے گا بلکہ نفع خود ہمارا ہے کہ ہم حسینؑ کے ذریعہ اپنی زندگی کو سنواریں اور دکھے دلوں، ٹوٹی ہمتوں کو پر جوش اور حوصلہ مند بنائیں اور یزید کی حمایت کر کے اپنے اخلاق کو مسموم نہ بنائیں اور اس زہر کو

متعدی نہ ہونے دیں۔

کسی کا یہ کہنا تاریخ پر کتنا بڑا ظلم ہے کہ یزید اللہ کی عدالت سے سزایاب ہو چکا اب اپنی سزا بھگت رہا ہے اور حسینؑ اپنے درجات حاصل کر چکے آج ان پر اللہ کی رحمتوں اور نعمتوں کی سرمدی بارش ہو رہی ہے لہٰذا اب ان پرانے واقعات کے ذکر کا کیا فائدہ؟ اگر پچھلے واقعات کے ذکر کا کوئی فائدہ نہیں تو تاریخ کا فن بے کار ایجاد کیا گیا جس پر لاتعداد صاحبانِ علم وعقل نے اپنی زندگی صرف کی اور اس شعبۂ علم پر زیادہ سے زیادہ توجہ دی جا رہی ہے۔ آثارِ قدیمہ جمع کئے جاتے ہیں اور پرانے آثار کی کھدائی پر بے اندازہ دولت ووقت خرچ کیا جا رہا ہے ہندوستان سے آج جب انگریز جا چکا ہے اس کا ظلم وجور بے نشان ہو چکا ہے تو ہندوستانی قوم ان کے ظلم وستم کے شکار ہونے والوں کی یاد کیوں مناتی ہے۔ ان کی تاریخ کیوں مرتب کی جا رہی ہے۔ ملک وقوم پر قربان ہونے والوں کی نشانیاں کیوں قائم کی جا رہی ہیں ہر صاحب ہوش کہے گا کہ پچھلے واقعات آئندہ اقدامات کی بنیاد بنتے ہیں۔ شہیدوں کا ذکر قوم کی تربیت کا سبب بنتا ہے۔ پھر قابل حیرت بات یہ ہے کہ حسینؑ کے تذکرہ کو فرسودہ کہنے والے خود فرسودہ افراد کے تذکرہ کو زندہ کرنے میں منہمک ہیں۔ اگر واقعاتِ گذشتہ کا تذکرہ بے کار ہوتا تو قرآن مجید انبیاء ماسبق کے حالات کو نہ بیان کرتا اور نہ ان کے واقعات پر ''غور وفکر'' کی دعوت دیتا واقعۂ کربلا کی یاد منانے پر معترض ہونے والے کو پہلے حج پر معترض ہونا چاہئے جس کے واجب ہونے کے بعد نہ ادا کرنے والے کی موت کو اسلام کفر کی موت قرار دیتا ہے۔ کیا حج میں جناب ابراہیم وجناب اسماعیلؑ اور جناب ہاجرہ کے واقعات کی یاد کو تازہ نہیں کیا جاتا شیطان کبھی ان حضرات کا سدراہ ہوا تھا آج اس کی جگہ پتھر کے ستون قائم کر کے

ان پر کنکری مارنے سے کیا شیطان کو چوٹ لگتی ہے؟ کیا مسلمان خدا کے اس حکم کو فعل عبث کہنے کی جرأت رکھتا ہے؟ ستون شیطان تو نہیں ہیں صرف اس کی طرف منسوب ہیں اور ستون سے اظہار نفرت شیطان اور اس کے اعمال سے اظہار نفرت ہے جب قابل نفرت ذات سے منسوب ہونے والی چیز قابل نفرت ہوتی ہے تو محبوب وقابل تعظیم شخصیت سے منسوب چیزیں محبت وتعظیم کے قابل کیوں نہیں ہیں؟ اور ضرور ہیں۔ چنانچہ صفا اور مروہ کی پہاڑیاں جہاں جا کر جناب ہاجرہؑ اپنے فرزند کے لیے پانی تلاش کرتی تھیں وہ قابل تعظیم ہیں قرآن مجید ان کو شعائر اللہ کہتا ہے۔ ''إِنَّ الصَّفَا وَالْمَرْوَةَ مِنْ شَعَائِرِ اللهِ'' (پ۲، رکوع ۳) جناب اسماعیل کی قربانی کی تاسی میں قربان کئے جانے والے اونٹ بھی شعائر الٰہی ہیں۔ ''وَالْبُدْنَ جَعَلْنَاهَا لَكُمْ مِنْ شَعَائِرِ اللهِ لَكُمْ فِيهَا خَيْرٌ''(پ۱۷، رکوع ۱۲) اور شعائر خدا قابل تعظیم ہیں بلکہ ان کی تعظیم کرنے والے ہی متقی ہوتے ہیں۔''

''وَمَنْ يُعَظِّمْ شَعَائِرَ اللهِ فَإِنَّهَا مِنْ تَقْوَى الْقُلُوبِ''(پ۱۷، رکوع ۱۱)

جناب ہاجرہ پریشانی کے عالم میں تلاش آب کے لیے جس طرح دوڑ رہی تھیں آج ہر حاجی کو اسی طرح چلنا پڑتا ہے۔ ان واقعات کی نقل کرنے اور ان کی یاد منانے سے ظاہر ہے جناب ابراہیمؑ واسماعیلؑ وہاجرہؑ کو کوئی فائدہ نہیں بلکہ اس کے ذریعہ ہم فائدہ اٹھاتے ہیں کہ خدا کی راہ میں قربانی کا جذبہ کی سال بہ سال تجدید ہوتی جاتی ہے۔

واقعہ کربلا جناب اسماعیلؑ کی قربانی سے کہیں زیادہ سامان تعلیم وتربیت رکھتا ہے خدا نے آثار غم پیدا کر کے (اور ایسے آثار غم جو حسینؑ سے قبل کسی شہید کے لیے نہیں

پیدا کئے گئے حتیٰ کہ وفات جناب سرور کائنات پر بھی نہیں) اپنی اس خواہش کا مظاہر کیا
کہ حسینؑ کی یادگار منائی جائے لہٰذا حسینؑ سے منسوب چیزیں شعائر اللہ ہیں۔ ان کی
تعظیم ومحبت تقویٰ ہے۔ آنکھوں پر پٹی باندھ کر دیکھنے والوں کو اگر یہ بت پرستی نظر آئے
تو مجرم کسے قرار دیں۔ آفتاب کو یا شپرہ کو؟ واقعہ ایک ہی ہوتا ہے اثر لینے والے مختلف
ہوتے ہیں۔ رسول کے جس فعل میں مومن کو قوت اعجاز نظر آتی ہے سن کر اسی کو جادو کہتا
ہے۔ قرآن نبیؐ کی باتوں کو وحی بتاتا ہے۔ نہ ماننے والا اسے مجنون کی باتیں قرار دیتا
ہے۔ قرآن مجید ہدایت کے لیے آیا ہے لیکن وہی ہدایت پا سکے گا جو متقی ہوگا ھدی
للمتقین خود اس کا اعلان ہے اسی طرح واقعہ کربلا سے وہی فائدہ حاصل کر سکے گا جو اس
سے اثر لے گا۔

آنحضرتؐ امام حسینؑ سے محبت کو اپنی محبت قرار دیتے ہیں جو مسلمان اپنے کو شمع
نبوت کا پروانہ سمجھتے ہیں وہ پروانہ وار حسینؑ سے محبت کریں گے حسینؑ ہر مسلمان کے محبوب
ہیں اگر طریقۂ محبت الگ الگ بھی ہو تب بھی ان میں امام حسینؑ کے بارے میں کوئی
نزاع نہ ہونی چاہئے کیونکہ سب کا محبوب ایک ہے نہ کسی حسینی کو حق ہے کہ اپنی طرح
دوسرے کو بھی محبت کرنے پر مجبور کرے۔ چنانچہ ہم کسی کو عزاداری وتعزیہ داری کرنے پر
مجبور نہیں کرتے اور نہ کسی کو یہ حق پہنچتا ہے کہ وہ دوسرے کو اس کے اپنے طریقہ محبت سے
روکے ہم نے یہ تو دیکھا ہے کہ اجنبی شخص صاحب غم کا شریک نہ بنے مگر یہ نہیں دیکھا کہ
کسی کے رونے سے کوئی خفا ہو یا چڑھے۔ تعجب ہے کہ ہمارا حسینؑ پر رونا کسی کو کیوں برا
لگتا ہے۔ کیا اس خفگی کی وجہ وہی ہے جس کی بنا پر جناب یعقوبؑ کا گریہ برادرانِ یوسف کو
ناگوار ہوتا تھا۔

کوئی دوسرے پر نہیں روتا جو روتا ہے وہ اپنے لئے۔ بچہ پیدا ہو کر روتا ہے تو
اپنے لیے کسی کی موت پر رونے والے روتے ہیں تو مرنے والے پر نہیں ورنہ سب ہی
روتے بلکہ صرف وہی لوگ روتے ہیں جن کے دل کو اس کی موت سے چوٹ لگی ہے، ان
کا رونا اپنی تکلیف اور قلبی اذیت کے باعث ہوتا ہے۔ کسی پسر مردہ ماں کے بین اور غمزدہ
باپ کے تاثرات میں یہی ملتا ہے کہ اب ہم کیونکر جئیں گے۔ بیوہ یہ کہہ کر روتی ہے کہ کس
کے سہارے چھوڑے جا رہے ہو یتیم کی فریاد ہوتی ہے اب ہم سے کون محبت کرے گا
تعزیت اور تسلی دینے والے وارثوں کو سمجھاتے ہیں کہ دل سنبھالو لہٰذا حسینؑ پر کوئی نہیں
روتا جو روتا ہے وہ اپنی قلبی اذیت کے باعث جس کے دل کو حسینؑ کی تکلیف سے ٹھیس نہیں
پہنچتی وہ نہیں روئے گا اور جس کا دل پارہ پارہ ہو جاتا ہے وہ آنسو روک بھی نہیں سکتا رونا
فعل غیر اختیاری ہے آنسو نکالے نہیں جاتے نکل پڑتے ہیں۔

جب رونا دل کے ٹھیس لگنے پر موقوف ہے تو کسی کا غم اتنے ہی افراد منائیں
گے مرنے والا اپنی زندگی میں جتنوں کے لیے جیتا تھا آفاقی غم اسی کا ہو سکتا ہے جو بنی
نوع انسان کیلیے جئے اور انہیں کے لیے مصائب جھیلے حسینؑ پر تمام انسان اسی لیے
روتے ہیں کہ ان کی زندگی اور موت کے مقاصد ذاتی یا خاندانی یا قومی نہ تھے بلکہ بنی
نوع انسان کے لیے قربانیاں دی تھیں۔ غم حسینؑ سے اختلاف کرنے والوں کے پاس
بھی اگر حسینؑ جیسی محبوب شخصیتیں ہوتیں جن کا غم آفاقی ہوتا مگر وہ غم و ماتم سے اختلاف
کے باعث اپنے محبوب کا غم نہ کرتے تو ہم پر بھی ان کے اختلاف کا اثر پڑتا لیکن غم حسینؑ
سے وہ لوگ روکتے ہیں جن کے پاس ایسے محبوب افراد نہیں ہیں جن کا دنیا ماتم کرتی۔
ان کے مسلسل اختلاف سے اس خیال کو تقویت ہوتی ہے کہ وہ اپنی بے مائیگی پر پردہ

ڈالنے کے لیے حسینیت کی شمع کو بے پروانہ بنانا چاہتے ہیں مگر یہ ممکن نہ ہوگا کیونکہ اگر عزائے حسینؑ کی بنا بندوں کی ڈالی ہوئی ہوتی تو شاید انسانوں کی مخالفت کچھ اثر انداز ہوتی مگر جب تحریک عزا کا محرک خود خدا ہے تو نہ محرک سے کوئی ٹکر لے سکتا ہے نہ اس کی تحریک کبھی کمزور ہوسکتی ہے۔

حسینؑ اور واقعہ کربلا کی عظمت واہمیت کا اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ قرآن مجید میں اس موضوع پر متعدد آیات موجود ہیں جن کا اجمالی تذکرہ یہاں پر کیا جارہا ہے۔ پارہ ۲۶، رکوع ۲۔ ترجمہ پیش کیا جاتا ہے۔ اس آیت میں اس انسان کا تذکرہ ہے جس سے خدا نے والدین کے ساتھ احسان کرنے کی وصیت کی جس کے زمانہ حمل میں اور وقت ولادت غم تھا جس کی مدت حمل ورضاعت ڈھائی سال ہے جس نے وی ہوکر چالیس سال کے سن میں دعا کی کہ پالنے والے مجھے ایسی توفیق دے کہ میں ان تمام نعمتوں کا شکرادا کروں جو تو نے مجھے یا میرے والدین کو دی ہیں اور ایسا عمل صالح انجام دوں جس سے تو راضی ہوجائے اور میری ذریت میں سے کچھ کو صالح بنادے میری بازگشت تیری طرف ہو اور میں تیرا مسلمان ہوں۔'' ظاہر ہے کہ عام انسانوں کا ذکر نہیں ہے بلکہ مذکورہ اوصاف امام حسینؑ کے حالات سے مطابق ہوتے ہیں آپ کی خبر شہادت کے باعث قبل ولادت اور وقت ولادت غم تھا اور ایسا غم کہ رسولؐ روتے ہیں۔

مدت حل ورضاعت ڈھائی سال ہے جبکہ رضاعت کی مدت دوسال ہوتی ہے۔ لہٰذا مدت حمل ۶ ماہ ہوئی اور علماء شیعہ واہل سنت نے لکھا ہے کہ آنحضرتؐ کی امت میں امام حسینؑ کے علاوہ کوئی بچہ زندہ نہ رہا جو چھ ماہ میں پیدا ہوا ہو۔

جو دعائیں اس آیت میں مذکور ہیں وہ امام حسینؑ سے مطابق ہوتی ہیں اللہ سے پائی ہوئی ہر نعمت کو اس راہ میں قربان کر کے شکر کیا۔ اور خدا نے بعد شہادت آثار غم پیدا کر کے اپنی خوشنودی کا اعلان فرمایا آپ کی ذریت میں ۹ امامؑ ہوئے جن کے صالح ہونے کا دوست دشمن ہر ایک قائل ہے۔ جناب ابراہیمؑ واسماعیلؑ مسلمان بنانے کی دعا کرتے ہیں۔ یہ صرف حسینؑ ہوسکتے ہیں جو کہیں میں تیرا مسلمان ہوں۔ جنہوں نے سب کچھ اللہ کو سونپ دیا۔

(۲) ''وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَيْءٍ مِنَ الْخَوْفِ وَالْجُوعِ وَنَقْصٍ مِنَ الْأَمْوَالِ وَالْأَنفُسِ وَالثَّمَرَاتِ وَبَشِّرِ الصَّابِرِينَ ''(سورہ بقرہ/۱۵۵)

اس آیت میں ان لوگوں کا ذکر ہے جس کا امتحان خوف، بھوک، اور مال وجان، اولاد کے نقصان کے ذریعہ لیا جائے گا ایسے افراد جن کا بیک وقت مذکورہ بالا تمام چیزوں میں امتحان لیا گیا ہو صرف واقعہ کربلا میں ملتے ہیں۔ بلکہ جتنا سخت امتحان مذکورہ بالا چیزوں میں کربلا والوں کا ہوا اور جس شان سے وہ امتحان میں کامیاب ہوئے تاریخ اپنے دامن میں اس کی نظیر نہیں رکھتی۔

''إِنَّ اللهَ اشْتَرَى مِنَ الْمُؤْمِنِينَ أَنفُسَهُمْ وَأَمْوَالَهُمْ بِأَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ يُقَاتِلُونَ فِي سَبِيلِ اللهِ فَيَقْتُلُونَ''(سورہ توبہ/۱۱۱)

اللہ نے کچھ مومنین کی جان ومال کو جنت کے وعدہ پر خریدا ہے اور یہ مومنین وہ ہیں جو راہ خدا میں لڑتے ہیں دشمن کو قتل کرتے ہیں اور پھر خود قتل ہوجاتے ہیں۔

ایسی جنگ جس میں سارے مجاہد لڑیں، قتل کریں اور شہید ہوجائیں صرف کربلا کی جنگ ہے ورنہ ہر جنگ میں مجاہدین کا ایک حصہ شہید ہوتا ہے تو بقیہ لوگ بچ رہتے ہیں

اور جان کے ساتھ مال بھی لٹ جائے اور وہ بھی اس طرح کہ سر چھپانے کے لیے چادر بھی نہ ہو صرف واقعہ کربلا میں نظر آتا ہے۔

(۴) ''وَالْفَجْرِ ، وَلَيَالٍ عَشْرٍ ، وَالشَّفْعِ وَالْوَتْرِ ، وَاللَّيْلِ إِذَا يَسْرِ''

خداوند عالم اس آیت میں پانچ چیزوں کی قسم کھا رہا ہے۔ صبح، دس راتیں، جفت، طاق، رات، جب وہ آنے لگے۔

قسم اہم چیز کی کھائی جاتی ہے۔ علامہ فخر الدین رازی کہتے ہیں کہ اس سے دس ذی الحجہ کی صبح مراد ہے لیکن صبح عاشورا اس سے کہیں زیادہ اہم ہے۔ پھر صبح عاشور سے وابستہ دس راتیں بھی اہم ہیں اور یکم سے دس ذی الحج تک کی راتوں کو کوئی اہمیت نہیں حاصل ہے۔ عشرہ محرم کی دس راتوں میں ۷، ۹، اور ۸، ۱۰ کی طاق و جفت راتوں کو پیاس کے باعث خصوصی اہمیت ہے آخری قسم اس رات کی ہے جو شروع ہوئی شب عاشور زیادہ مستحق ہے کہ مراد لی جائے کیونکہ وہ انتہائی اہم حالات میں شروع ہوئی۔

''وَالْعَصْرِ ، إِنَّ الْإِنسَانَ لَفِي خُسْرٍ ، إِلَّا الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ '' (پ ۳۰، رکوع ۷)

عصر کی قسم بے شک تمام انسان گھاٹے میں ہیں سوا عمل صالح کرنے والے مومنوں کے جو ایک دوسرے کو حق اور صبر کی وصیت کرتے ہیں۔

عصر عاشور کو ہر وہ انسان گھاٹے میں تھا جو حسینؑ سے جنگ کر رہا تھا جیسا کہ خود پسر سعد، حسینؑ سے لڑنے کو خسران مبین کہتا ہے اور امام کے اصحاب مومن تھے عمل صالح

کی ہر صنف کو بطور احسن انجام دے رہے تھے۔ ایک دوسرے کو حق اور صبر کی وصیت بھی کر رہے تھے۔ قرآن مجید کا یہ سورہ کربلا میں مجسم نظر آ رہا ہے۔

آئندہ کے لیے بھی عصر عاشور فیصلہ کن ہے کہ جو اپنے کو حسینؑ سے الگ رکھے گا وہ نقصان وخسارہ میں رہے گا اور جو اپنے کو حسینؑ کے ساتھیوں میں شامل کرے گا وہ نقصان سے محفوظ رہے گا۔

حسینؑ کا ساتھی کون ہوگا؟ سورہ عصر نے اس کے اوصاف بیان کر دیئے ہیں۔

مومن ہو۔ اعمال صالح بجالائے، خود حق کا پابند رہ کر دوسروں کو پابندی حق کی وصیت کرے پابندئ حق میں اس نے مصائب جھیلے ہوں تاکہ اس کی زندگی دوسروں کو دعوتِ صبر دے سکے۔ خیال پیدا ہوسکتا ہے کہ جب واقعۂ کربلا نظر شارع وشریعت میں اتنا اہم تھا تو بہ صراحت قرآن مجید میں اس کا ذکر یوں نہ کیا گیا؟ قرآن اگر غیر حکیم کا کلام ہوتا تو ضرور بہ صراحت تذکرہ ہوتا لیکن عالم الغیب خدا بعد وفات سرور کائناتؐ کے حالات سے واقف تھا کہ حسینؑ کو غیر مسلم نہیں بلکہ مسلمان قتل کرے گا لہٰذا جو مسلمان حسینؑ کا قاتل بنتا وہ اس قرآن کو پہلے مٹا دیتا جس میں ذکر حسینؑ ہوتا مصلحت کا تقاضہ یہی تھا کہ ذکر کیا جائے مگر اس طرح کی مظلوم کا ذکر ظالم کی دست برد سے محفوظ رہ سکے۔

آخر کلام میں حسینیوں کی خدمت میں باادب گذارش کرنا ہے کہ انہوں نے تذکرۂ حسینیؑ کی قوت واثر کو دیکھا ہے وہ بخوبی اندازہ لگا سکتے ہیں کہ ''حسینی سیرت'' کتنی پرقوت اور پُر اثر ہوگی۔ اگر ہم حسین علیہ السلام کی سیرت کے مطابق زندگی بسر کریں تو نشرِ حسینیت کی عظیم خدمت انجام دیں گے بلکہ بڑی حد تک جناب سید الشہداء کا حق بھی

اداکریں گے کیونکہ سچا حسینی وہ ہے جوامام حسین علیہ السلام کی محبت کے ساتھ ساتھ ہراس چیز سے محبت کرے جوآپ کو پسند تھی اور یزید سے نفرت کے ساتھ اس کی ہر صفت سے نفرت کرے۔

خداوند عالم دنیاوآخرت میں ہم کوحسینی قرار دے۔

دکھی دنیا

زمانہ کی مادی ترقی اتنی تیز ہے کہ آنکھ والا درکنار نابینا بھی اسے محسوس کئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ زمین پر قدم قدم چلنے والا انسان، راکٹ کے ذریعہ چاند تک پہنچ رہا ہے۔ ساحل کے کنارے محفوظ ہوکر بھی سمندر کی موجوں سے سہم جانے والا انسان آج سمندر کے سینے کو چیر کر اپنی مرضی کے مطابق سطح اور سمندر کی تہوں میں سرگرم سفر ہے۔ کائنات کی ہر چیز پر قابو پانے کے لیے کوشاں انسان نے بہت سے سرکش نہ صرف رام کر لیے ہیں بلکہ ان کو اپنی مرضی کا پابند بناتا جارہا ہے۔ آج ہوا، پانی، آگ، موسم، بلندی، پستی غرضکہ کانات کی ہر چیز سے لڑنے اور ان کو زیر کرنے کی خواہش میں انسانی قدم بہت کچھ آگے بڑھ چکے ہیں۔ اور بڑھ رہے ہیں مگر ترقی کا ''مور'' اپنے پیروں پر جب نظر ڈالتا ہے تو ضرور شرمندہ ہوکر بے حوصلہ ہونے لگتا ہے۔ ترقی کے بال وپر یقیناً بہت خوبصورت ہین لیکن انسانی زندگی یعنی ترقی کے پیر روز بروز اتنے مکروہ اور بھیانک ہوتے جارہے ہیں کہ مسرت کے بجائے انسان رنج، خوف، غم، فکر میں ڈوبتا جارہا ہے۔ ترقی پسند انسان تہذیب وتمدن میں ترقی کے بجائے جاہلیت وجنگلی تمدن کی طرف واپس آرہا ہے۔ چلنا بڑھنے کا نام نہیں ہے۔ کولھو کا بیل بھی چلتا ہے مگر بڑھتا نہیں۔ اگلے تمدن اور موجودہ تمدن کے نتائج ملا لیجئے تو اندازہ ہوگا ہم بھی صرف چکر میں رہے ہیں۔ جہاں سے چلے تھے آج بھی وہیں کھڑے ہیں۔ کل انسان جاہل جنگلی، ظالم غیر مہذب، ناآشنائے تمدن ہوکر جو

کچھ کررہا تھا آج ہم ترقی، تمدن، تہذیب علم ودانش کے نام پر وہی کچھ کررہے ہیں۔ جنگلی انسان برہنہ تھا مجبوریوں کا عذر بھی اس کے پاس تھا چنانچہ اس نے تہذیب میں قدم رکھے تو درختوں کی چھال اور پتے اس کا لباس بن کر بے سامانی کا اعلان کررہے تھے مگر آج کا انسان لباس کی بہتات کے باوجود فطری آزادی کے نام پر برہنہ رہنے کا مطالبہ کررہا ہے اور تہذیب جدید اس کے مطالبہ کو خلاف تہذیب قرار دے کر رد نہیں کررہی ہے البتہ ننگوں کی اقلیت کو لباس پہننے والوں کی اکثریت کے باعث برہنہ رہنے کی فی الحال کھلی چھوٹ نہیں دے رہی ہے۔ لیکن خالی جزیرے ''فطری آزادی'' کے لیے وقف کئے جارہے ہیں۔ کون جانے ننگوں کی اقلیت کب اکثریت میں بدل جائے اور لباس کے حامی کب غیر آباد جزیروں میں محبوس کردیئے جائیں۔ دیکھنے کی بات یہ ہے کہ جہالت نے ہم کو برہنہ رکھا تھا آج کا علم وتہذیب ہم کو پھر برہنہ کررہا ہے۔ انسانی ترقی نے ایک چکر پورا کرلیا ہے۔ اخلاق وعقل کو چکر آرہے ہیں جس کی تیمارداری کرنے والا کوئی نہیں۔ اگر کچھ ہمدرد اٹھے بھی تو ان کو ہسٹیر یا کا مریض قرار دیا جائے گا۔ کل عرب کا جاہل باپ بے رزقی کے خوف سے اولاد کو قتل کررہا تھا۔ باپ ہوکر بیٹی کا گلا دبا رہا تھا آج ہم ان واقعات کو سن کر بے چین ہوئے جاتے ہیں لیکن عصر حاضر کی عقل وعلم وتہذیب نے ہم کو پھر اس جگہ لا کھڑا کیا ہے کل ہم جہاں سے چلے تھے۔ غور کیجئے غلہ کی کمی کا ''فیملی پلاننگ'' سے علاج ہورہا ہے اور مخالف، جاہل اور دقیانوسی قرار پارہا ہے۔ کیا ساری زمین قابل کاشت بنالی گئی ہے۔ یا جو قابل کاشت تھیں ان پر زراعت ہورہی ہے؟ زراعت کا ماحصل غلہ بازار میں آرہا ہے یا ذخیرہ اندوزوں کے گوداموں میں جارہا ہے۔ کاش ماں کے ''رحم'' میں فیملی پلاننگ کی جھاڑو سے پہلے ''بے رحم'' ذخیرہ اندوزوں کے

گوداموں میں جھاڑو دے لی جاتی۔ فیملی پلاننگ اقرار واعلان ہے کہ ہم نسل کشی کرسکتے ہیں لیکن اپنی ہوس کو نہیں قتل کرسکتے۔ فیملی پلاننگ نے غذائی مسئلہ کتنا حل کیا ابھی تک اس کی کوئی فرضی داستان بھی سننے میں نہیں آئی۔ البتہ کچھ گھر بے چراغ ہوگئے کیونکہ موجودہ بچوں کو موت لے گئی۔ پیدا ہونے والوں کو ہم نے معدوم کردیا۔ اور زندگیاں ایسی رات بن گئیں جن کو امید سحر بھی نہیں دوسری طرف حمل کا خوف اگر بدکاریوں کی راہ میں رکاوٹ تھا تو اب فیملی پلاننگ کے سایہ میں سہولتوں میں اضافہ ہوگیا ہے۔ مانع حمل دوائیں اور تدبیریں بھی ابھی تک ایٹمی توانائی کی طرح صرفِ تعمیر تو نہیں ہوسکی ہیں البتہ تہذیب وشرافت کے کئی ''ہیروشیما اور ناگاساکی'' تباہ کرچکی ہیں۔ آگے آگے دیکھئے......

کل کی تہذیب وتمدن سے خالی دنیا کا مذموم ترین فعل صنف نازک (عورت) کے ساتھ بدسلوکی تھا ہم نے اس معاشرہ پر اتنی سخت تنقید کی کہ عورت کے زیورات کو اس کی اسیری وکنیزی کی زندگی کی علامت قرار دیا۔ کنگن کو ہتھکڑی، ہار کو طوق، پازیب کو بیڑی اور کمر کی زنجیر کو لنگر بتایا۔ پچھلی زندگی کی اتنی مہیب جراحی کی کہ آج کی عورت زیور درکنار چوڑی سے بھی نفرت کررہی ہے۔ ناک کی کیل سہاگ کی نشانی تھی مگر ہماری ریسرچ میں وہ عورت کی تذلیل کا نشان قرار پائی۔ ہم نے اعلان کیا اب عورت کو اس کا اصل اور بلند مقام ورتبہ حاصل ہوگیا۔ مگر اسے کیا کروں کہ میری آنکھ کل سے زیادہ عورت کو آج اسیر دیکھ رہی ہے لیکن جس ہتھکڑی، بیڑی، طوق اور شکنجہ میں اسیر ہے وہ نظر نہیں آتے کیونکہ یہ آرٹ اور کلچر کے بنے ہیں، لوہے یا چاندی سونے کے نہیں ہیں۔ کل عورت جانوروں کی طرح خریدی بیچی جاتی تھی مگر آج ایسا ناکارہ مال قرار پائی ہے جس کے دیکھنے چھونے اور ہوس بھر چکھنے والے تو بہت ہیں مگر خریدنے اور گھر لے جانے اور رکھے والے بہت کم

ہیں۔عزت ورتبہ دینے والے کہاں؟ آج ہرعورت کے دل ودماغ میں جب وہ ایک ناتجربہ کارنوخیزلڑکی کا دل ودماغ ہوتا ہےتہذیب وتمدن کے نام پرسنیما، ناول، افسانے آزادشاعری، ریڈیو، کلچر پروگرام، ڈانس، مشترک تعلیم اوران گنت چیزوں کے ذریعہ یہ بات ذہن نشین کردی جاتی ہے کہ کامیاب زندگی بسر کرنے کا واحد ذریعہ یہی ہے کہ لڑکی عورت بننے سے پہلے ہرمرد کے لیے زیادہ سے زیادہ پُرکشش بن جائے۔ بے حیاماں باپ لڑکی لڑکوں کے ملاپ کی انجان بن کرکوشش کرتے رہتے ہیں تاکہ دیکھ سکیں کہ نور چشمی کوگھائل کرنے کی کتنی مہارت ہے۔ ہوس کا کوئی اندھا اگرمل جاتا ہےتو پھولے نہیں سماتے اور یہ نہیں سوچتے کہ جس نے آج دوسروں کی طرف سے آنکھ بند کرلی ہے وہ کب تمہاری نورنظر سے آنکھ نہ پھیر لے گا۔ جنسی جوش زندگی کو بہا تو سکتے ہیں مگر سفینۂ حیات کے ساحل نہیں بن سکتے۔ پُرکشش بننے کی اندھا دھند تبلیغ نے آج عورت کے قلب ودماغ کومرد کی نظر کا اسیر کچھ اس طرح کیا ہے کہ مرد سوٹ پہننے جارہا ہے اوراس کے ساتھ اس کی بیوی یا بہن یا لڑکی یا ماں ہے جس کی ٹانگیں رانوں تک کھلی ہیں سردی میں سر کے محافظ بال ہیں جو تراشے جاچکے ہیں، سینہ کھلا ہے۔ پیٹ بے نقاب ہے، جذامی تمدن کا زہریلا پیپ ہرعریاں حصۂ بدن کے ذریعہ انسانی تہذیب واخلاق کے پیکر میں جذب ہورہا ہے جسے عقل کے کوڑھی شہ رگ میں دوڑنے والا زندہ اورتازہ خون سمجھ رہے ہیں۔ گھریلو زندگی دراز پڑ چکی ہیں۔ خاندان کی عمارت میں شگاف پڑ گئے ہیں۔کل نالائق اولاد ماں باپ سے عاجزتھی آج ماں باپ اولاد کے تصور سے گھبرارہے ہیں۔سنیما دیکھنے کے لیے کمسن اور شیرخوار بچے اکیلے کمروں میں مقفل پڑے محلّہ والوں کی نیند خراب کررہے ہیں۔ ماں باپ افسانوی عشق ومحبت سے ذکی الحس جنسیت کی خارش کو

کھجلا کراپنے ہی کونوچ رہے ہیں اوروقتی لذت خارش میں محو ہیں ہوش جب آتا ہے جب زندگی اپنے ہاتھوں لہولہان ہوچکی ہوتی ہے اور سوسائٹی خارشی کتا قرار دے کر اپنے قریب پھٹکنے نہیں دیتی۔ اپنی آگ میں جلنے والے اخلاقی آتشک کے مریض سلگتی زندگی بسر کررہے ہیں جو جل کرختم بھی نہیں ہوتی اور دھواں اتنا ہے کہ ایک سانس بھی اچھی نہیں لے سکتے کرداری آتشک کے مریض ماں باپ اخلاقی مبروص اولاد کوجنم دے کرانسانیت کو داغدار کررہے ہیں دوراور بہت دور موجودہ ترقی کے آسمان سے شیان انسان کی حالت دیکھ کرقہقہہ لگارہا ہے۔گھروں کی حالت بیان ہوئی۔ پڑوسی جھگڑا کرکے پڑوس کا حق ادا کررہے ہیں طبقاتی جنگ درندوں سے زیادہ بھیانک انداز پرلڑی جارہی ہیں۔ فرقہ واریت کا اژدھا سب کونگلتا چلا جارہا ہے۔ پیاسی زمین انسانی لہو پی رہی ہے بھائی بھائی کا گلا اس مسرت سے کاٹ رہا ہے جیسے کسان کھیتی کاٹتا ہے۔ اندرون ملک وہ خلفشار ہے کہ حکومتیں چوندھیائی جارہی ہیں۔ بڑی قومیں اسے سینکڑوں بم لیے وقت کی تاک اورگھات میں بیٹھی ہیں جن میں کا ایک بم بھی ساری نسل انسانی کوچشم زدن میں نیست ونابود کرسکتا ہے۔خوف کا دوردورہ ہے۔ دہشت کا سکہ چل رہا ہے۔خون چوسا جارہا ہے۔خون برسایا جارہا ہے۔ دولت کے قصر میں خون کا گارا ہے۔ سیاست کی کشتی خون میں چل رہی ہے۔ وہ خون جو دل کا سرمایہ تھا انسانیت کا دل خون ہوچکا ہے۔ آدمیت سسک رہی ہے۔اس کی پیشانی پرموت کا پسینہ ابھررہا ہے اخلاق کی نبض ڈوب رہی ہے تہذیب کی آنکھیں پتھرا گئی ہیں۔ شرافت کی سانس اکھڑ چکی ہے۔ مادیت انسانیت کی قبرکھودے روحانیت کی لاش دفنانے کے لیے ہاتھ پھیلائے ہے۔ سائنسی ترقی آدمیت کی قبر پرمحیرالعقول مقبرہ کی تعمیر کے انتظام میں بڑی مسرت کے ساتھ منہمک

ہے۔ یہ ہے اس وقت کی دکھی دنیا کا ہلکا سا نقشہ۔

آج بھی اور کل بھی مذہب ریاضی کے واضح حساب کی طرح انسان کو اس کی غلط روش اور خطا کی نشاندہی کر رہا ہے مگر مسیحا کو ملک الموت کہہ کر لوگوں کو اس سے ڈرایا اور دور رکھا جا رہا ہے۔ حساب فہی کی غیر مرغوب صنف کو مذہب کی بنیاد بتا کر معاشرۂ انسانی کو مذہب سے بے زار بنانے کی تبلیغ زور وشور کے ساتھ جاری ہے۔ حالانکہ اگر زمانہ ذرا دم لے۔ وقت ذرا آنکھ کھولے تو انسان تباہی کے موڑ کو پہچان سکتا ہے۔ تاریخ انسانی کو حساب کے اصول جمع وتفریق میں دیکھئے۔ تو معلوم ہو جائے گا کہ ہم نے کہاں غلطی کی ہے۔ مثال کے لیے پہلے ایک حساب لگائیے۔ ایک شخص نے ایک بہشتی سے ۳۰/مشک پانی ۲/ پیسے میں ۳/مشک کے حساب سے لیا اس کے بعد ۳۰ مشک پانی ۳/ پیسے میں ۲/مشک کے حساب سے لیا اس نے پہلے موٹا حساب جوڑا کہ ۲/ پیسے میں ۳/مشک اور ۳/ پیسے میں ۲ مشک یعنی ۵ پیسے میں ۵ مشک کا اوسط پڑا۔ لہٰذا ۶۰ مشک پانی کے ساٹھ پیسے دینے پر تیار ہو گیا لیکن بہشتی نے الگ الگ حساب لگایا کہ ۲/ پیسے میں ۳/مشک کے حساب سے ۳۰/مشک پانی کے دام ۲۰/ پیسے اور ۳/ پیسے میں ۲/مشک کے حساب سے ۴۵/ پیسے ہوئے۔ ۴۵۔ ۲۰، ۶۵ پیسے ہوئے۔ دونوں کا حساب الگ صحیح معلوم ہو رہا ہے مگر میزان ایک نہیں آتی جس کے معنی ہیں کسی حساب میں کوئی غلطی ہوئی بہشتی کا حساب درست تھا ۶۵ پیسے میزان صحیح تھی۔ ۵ پیسے میں ۵ مشک کا حساب بھی درست تھا لیکن غلطی یہ ہوئی کہ ۵ پیسے میں ۳ مشکیں ۲ پیسے میں ۳ مشک والی شامل تھیں۔ اور ۲ مشکیں ۳ پیسے میں ۲ مشک والی شامل تھیں۔ لہٰذا ۵ پیسے کو ۱۰ سے ضرب دینا درست تھا کیونکہ اس ضرب میں دونوں طرح کی مشکیں برابر شامل ہو سکتی تھیں۔ یعنی بحساب ۲ پیسے

میں تین مشک کو ۱۰ سے ضرب دیا تو ۲۰ مشکوں کا حساب پورا ہو گیا اور ۳ پیسے میں ۲/مشک کو ۱۰ سے ضرب دیا تو ۲۰ مشکوں کا حساب پورا ہو گیا۔ مگر دس مشکیں باقی رہ جاتی ہیں جن کی قیمت ۳ پیسے میں ۲ مشک کے حساب سے ۱۵ پیسے آتی ہے لیکن ہم نے ان کی ۵ پیسے مین ۵ مشک کے حساب سے قیمت ۱۰ پیسے لگائی اس غلطی نے میزان میں ۵ پیسے کا فرق کر دیا۔ اگر میزان ایک ہو جاتی تو دونوں حساب درست ہوتے فرق نے بتلایا ایک حساب غلط ہے۔ اسی طرح انسان جاہل، غیر متمدن، غیر مہذب تھا تو انسان خونخوار تھا۔ بے چین تھا۔ آج ہم نے علم پھیلایا، تمدن بنایا، تہذیب قائم کی تو انسان میں بے چینی نہ ہونا چاہئے تھی۔ آج انسان ظالم اور خونخوار نہ ہوتا مگر ہم دیکھ رہے ہیں کل کا جاہل غیر متمدن غیر مہذب انسان جتنا ظالم، خونخوار اور بے چین تھا آج کا عالم، متمدن، مہذب انسان کچھ کل سے زیادہ بے چین ہے۔ ظلم اور خونخواری میں اضافہ ہو گیا ہے۔ تو ہم کو سوچنا پڑتا ہے کہ علم، تہذیب، تمدن کے باوجود ہم سے کوئی چیز چھوٹ گئی اور جب تک اس چھوٹ جانے والی چیز کو نہ معلوم کر لیں گے اسے نہ حاصل کر لیں گے تب تک ترقی کے باوجود بھی ہم پر سکون ومطمئن نہ ہوں گے۔

وہ چیز مذہب ہے اور صرف مذہب۔ ہم نے سائنس کے ذریعہ کائنات کی قوتیں معلوم کر لی ہیں۔ ان پر قبضہ بھی کر لیا ہے مگر ہم یہ نہ معلوم کر سکے کہ ہماری زندگی کا مقصد کیا ہونا چاہئے۔ ان قوتوں کا مصرف کیا ہونا چاہئے۔ دوسرے لفظوں میں یوں سمجھئے کہ ہم نے دوسروں پر قابو پا لیا ہے چاہے وہ سمندر ہو یا پہاڑ، فضا ہو یا زمین کی تہیں۔ موسم ہو یا بارش غرضکہ انسان کا قبضہ بڑھتا جا رہا ہے مگر ہم نے اپنے پر قابو نہیں پایا ہے جس کا نتیجہ ہے کہ سائنس کا استعمال تعمیر کے بجائے تخریب میں ہو رہا ہے۔ ہم اپنے پر

کیسے قابو پائیں یہ ہماری سب سے بڑی بے بسی ہے۔ یہ کام سائنس سے نہیں ہوسکتا یہ کام صرف مذہب کا ہے۔ مذہب کا مٹنا لا مذہبی کا رواج انسانی معاشرہ کو سائنسی ترقی کے دور میں زیادہ تیزی سے تباہ کررہے ہیں اس دکھی دنیا کا علاج صرف مذہب ہے اور سچا مذہب۔

مریض کیسے اچھا ہو

مندرجہ بالا سطور میں دکھی دنیا کا نقشہ کھینچا گیا ہے اور اس کے دکھ کا سبب بیان ہوا۔ صرف مرض کی شہرت سے مریض اچھا نہیں ہوتا بلکہ اسباب کے ماتحت علاج وپرہیز ذریعہ شفا بنتا ہے۔ آج جب غیر درکنار مسلمان کی نظر میں بھی قرآن اور حدیث کی وقعت علماء مغرب کے اقوال کے سامنے کم حیثیت وکم رتبہ ہے تو مناسب معلوم ہوتا ہے کہ نظریہ ارتقا کے بانی ڈارون کے مشہور معاصر ہکسلے کا یہ قول نقل کیا جائے۔ ’’لامذہبیت کی دنیا مٹی کی مٹھائی ہے جس کو دو اندھے بچوں (مادہ اور قوت) نے بنایا ہے۔‘‘ علامہ اختر علی تلہری۔ ’’مذہبی تصورات‘‘ میں اس مقولہ کے بارے میں کیا خوب لکھتے ہیں: ’’اس حکیمانہ مقولہ کا اس کے سوا اور کیا مطلب ہوسکتا ہے کہ لامذہب کی دنیا عقل غایت اندیش‘‘ کی کارفرمائیوں سے محروم ہوتی ہے۔ اس کے ہنگاموں کا کوئی ماحصل نہیں ہوتا۔ اندھے بے شعور بچوں کی بنائی ہوئی دنیا مٹی کا گھروندا ہی تو ہوسکتی ہے۔ جسے ضابطۂ ترتیب اور معنی وغایت سے کوئی تعلق نہ ہو۔‘‘

دنیا میں جھوٹ، فریب، حق تلفی، قتل، ظلم، فتنہ، فساد جو کچھ ہے اس کی وجہ انسانی فطرت کا ایک خاصہ ہے۔ ’’زیادہ سے زیادہ لینے کا جذبہ‘‘ یہ جذبہ فطری ہے۔ بچے کو جو

چیز دینے کے لیے ہاتھ بڑھائے گا وہ لینے کے لیے ہاتھ پھیلا دے گا کیونکہ ’’لینے کا‘‘ فطرت سکھا رہی ہے۔ بالغ، عاقل، توانا اور صاحب اقتدار ہوکر انسان اسی ’’لینے‘‘ کے جذبہ کے ماتحت ساری دنیا صرف اپنے لئے مخصوص کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ اور جب اس جذبہ و خواہش کی تکمیل، سچ، عدل، حق کے ذریعہ نہیں ہوتی تو جھوٹ، سازش، مکر، قتل، ظلم وفساد کے ذرائع اختیار کرتا ہے قیام امن ناممکن ہے جب تک لینے کا جذبہ دینے سے نہ بدل جائے۔ کسی تقریر کی تعریف تو ممکن ہے لیکن اس پر عمل ممکن نہیں۔ الفاظ کی مدح ممکن ہے معنی سے عمل کو ہم آہنگ کرنا بہت دشوار ہے سچ اور عدل کی تعریف اور ظلم وفساد کی مذمت سب کردیں گے مگر عمل میں سچ کی جگہ جھوٹ اور عدل کی جگہ ظلم ہی نظر آئے گا البتہ ظلم کو عدل اور جھوٹ کو سچ ثابت کرکے ظلم کیا جائے گا اور جھوٹ بولا جائے گا۔ ضرورت ہے کہ فطرت کے اس راز کو ڈھونڈھا جائے جو لینے کے جذبہ کو دینے کے جذبہ سے بدل دے اسے بھی بچہ سے سیکھئے مٹی کا کھلونا، بچہ کے ہاتھ میں ہو آپ اس سے عمدہ کھلونا دکھا کر کہئے تم اپنا کھلونا دیدو تو میں تم کو یہ اچھا کھلونا دوں گا۔ بچہ فوراً راضی ہوجائے گا۔ معلوم ہوا بہتر پانے کی امید میں کمتر دیدینا فطرت ہے۔ اگر دنیا بس یہی دنیا ہے تو کسی عمدہ سے عمدہ نظریہ کے باوجود بھی انسان ظالم رہے گا۔ وہ کیوں دوسروں کی بھلائی کے لیے اپنے فائدہ کو چھوڑ دے اجتماعی مفاد کے لیے انفرادی نقصان کیوں برداشت کرے۔ یہ خیالات ہیں جن کا کوئی تسلی بخش جواب جو عمل میں تبدیلی پیدا کرسکے ممکن نہیں ہے اگر زندگی اس دنیا میں ختم ہے لیکن اگر یقین ہوجائے کہ اس دنیا کے بعد ایک دنیا اور بھی ہے اور یہاں جو کچھ ہے وہ اس دنیا کی ہر چیز کے مقابلہ میں بے حد کمتر ہے اور اس دنیا میں جس خدا نے ہم کو سب کچھ بے مانگے دیا ہے وہ خدا وعدہ کررہا ہے کہ

یہاں کی کمتر چیزیں اگر اس کے کہنے پر اس کے بندوں کو دیدو گے تو وہ خدا آخرت میں اس سے بہتر چیزیں دے گا۔ جبکہ یہ حقیقت بھی سامنے ہے کہ کسی کو نہ دو گے تب بھی موت کے وقت اپنا سب کچھ تم کو چھوڑنا پڑے گا جو دوسرا لے لے گا اور تمہارا کوئی احسان بھی نہ ہوگا۔ تو انسان میں بہتر لینے کا جذبہ کمتر دینا کو دوسروں کے مفاد میں صرف کر دینے پر آمادہ کرتا ہے۔ اس جذبہ میں تحریک اس وقت اور قوی ہو جاتی ہے جب خدا کے اوصاف سامنے آتے ہیں کہ اس کے لیے فنا نہیں جس سے یہ خطرہ مٹ جاتا ہے کہ جب ملنے کا وقت آئے تو کہیں ایسا نہ ہو کہ خدا نہ ہو۔ اس کا عالم ہونا یقینی دلاتا ہے کہ ہم نے جو کچھ دیا ہے وہ اس کے علم میں ہے اس کے عدل پر بھروسہ ہوتا ہے کہ جتنا دیا ہے اس کا عوض ضرور ملے گا۔ اس کا صادق ہونا ہم سے کہتا ہے کہ جب اس نے کم از کم دس گنا دینے کا وعدہ کیا ہے تو وعدہ ضرور پورا کرے گا زیادہ پانے کی امید قوی ہوتی ہے کہ اس نے بعض اعمال پر بے حساب دینے کا وعدہ کیا ہے۔ غرضکہ اوصاف الٰہی صرف عقیدہ نہیں ہیں بلکہ تعمیر سیرت وکردار کا ذریعہ ہیں اور یہی عقائد امن عالم کے اصلی محرک ہیں۔ معلوم ہوا کہ اگر خدا اور قیامت کا یقین پیدا ہو جائے تو ظلم عدل سے اضطراب سکون سے، حرص وہوس، صبر وقناعت سے بدل سکتے ہیں۔

نظریہ تجربہ کی کسوٹی پر

چاہے اصول کتنے ہی اچھے ہوں مگر بے کار ہیں جب تک ان کا نفاذ نہ ہو۔ نفاذ کے لیے ضرورت ہوتی ہے کسی نافذ کرنے والے کی۔ چنانچہ اس حیران وپریشان دنیا کو سکون وراحت بخشنے کے لیے آج سے چودہ سو سال قبل آنحضرتؐ تشریف لائے۔ اور

انہوں نے اسلام کے عملی نقشہ کو دنیا کے سامنے پیش کیا۔ دنیا نے دیکھا خونخوار درندہ صفت عرب اسلام سے قبل دولت، بدکاری، ظلم اور قتل عام کا حریص تھا۔ باپ دولت بچانے کے لیے اپنے ہاتھوں بیٹی کا گلا دبا کر فخر سے گردن اٹھاتا تھا۔ ایک قبیلہ کا اونٹ دوسرے قبیلہ کے سردار کے حوض میں ایک گھونٹ پانی پی لیتا تھا تو چالیس سال تک انسانی خون برستا رہتا تھا مگر تشفی نہ ہوتی۔ قتل پر سکون نہ تھا قاتل مقتول کا خون پیتا تھا۔ سینہ چاک کر کے دل جگر کچا چباتا تھا۔ آنکھ، ناک، کان، ہاتھ، پیر کاٹ کر ہار بنا کر پہنتا تھا اور خوش ہوتا تھا دیکھنے والے اس کی مدح اور تعظیم کرتے تھے۔

لیکن یہی عرب مسلمان ہو کر انسان بن جاتا ہے۔ اسلام کا نبیؐ اجڑے مہاجر کو مدینہ کے بسے ہوئے انصاری کا بھائی بناتے ہیں تو دولت کا پجاری عرب جو دولت کے لیے بیٹی کو زندہ دفن کرتا تھا آج اتنا بدلا ہوا نظر آتا ہے کہ مالدار انصاری لٹے ہوئے مہاجر کو اپنی آدھی جائداد کی پیش کش کرتا ہے۔ سوچئے اسلام کتنا بڑا انقلاب لایا تھا۔ اسلام نے حکومت کے بجائے انسانی کردار کی تعمیر کی تھی۔ اسلام کا طریقہ کار برائی مٹانے میں بڑے کو مٹانا نہ تھا بلکہ برے کو اچھا بنا کر برائی مٹائی جارہی تھی لہٰذا تلوار کی ضرورت نہ تھی سیرت کی ضرورت تھی۔ اور اسلام یوں انقلاب لا رہا تھا کہ دماغ وہی تھے مگر انداز فکر بدل گیا تھا۔ آنکھیں وہی تھیں مگر انداز نظر بدل گیا تھا۔ زبان وہی تھی مگر گفتار بدل گئی تھی۔ قدم وہی تھے مگر رفتار بدل گئی تھی۔ دل وہی تھے مگر جذبات ومحبت ونفرت کے سوتے اور دھارے بدل گئے تھے۔ ایک واقعہ اور سنئے جس سے اندازہ ہوگا کہ اسلام میں قومی گری کی کتنی عظیم طاقت ہے۔ آدمی کو آدمی بنانا آدمی باقی رکھنا صرف مذہب کا کام ہے بزم نبوت میں ایک بڑا قبیلہ کا سردار قیمتی لباس پہنے مودب بیٹھا ہے۔

ایک غریب مسلمان بھی اس کے پہلو میں آ کر بیٹھ جاتا ہے۔ دولت منداپنی عبا کے دامن سمیٹنے کی کوشش کرتا ہے ہادی عالم کی نظر تربیت پڑ جاتی ہے آپ خفگی اور رنج کے ملے جلے لہجہ میں ٹوکتے ہیں تم نے عبا کا دامن کیوں سمیٹا کیا تمہاری دولت اس کے پاس چلی جاتی یا اس کی غربت تم میں چلی آتی ۔ سردار قبیلہ مسلمان دست بستہ معافی مانگتا ہے۔ دنیا دیکھے جن کی جھوٹی عزت پر چالیس سال عوام کا خون بہا تھا آج وہ غریب اور عام مسلمانوں سے بھی معافی مانگ رہا تھا نبیؐ سے معافی مانگنا آسان تھا۔ لیکن اسلام نے انسان کو انسان کے برابر کر دیا تھا سردار مسلمان اپنے سردار نبی سے بھی معافی مانگ رہا تھا اور اپنے غریب بھائی سے بھی معذرت خواہ تھا کہ مزاج جاہلیت کی بچی کچی خوبو نے مجھ سے یہ غلطی کرائی ہے۔ سردار مسلمان اپنے مزاج کو اتنا جھنجھوڑ کے کفارہ کے طور پر اپنی آدھی ملکیت کا تحفہ اپنے غریب بھائی کے سامنے پیش کرتا ہے مگر وہ غربت کا مارا دولت لینے سے انکار کر رہا ہے۔

حضور کی سفارش بھی درمیان میں آجاتی ہے دینے والا بضد ہے کہ تحفہ قبول کرو۔ حضور سفارش فرمارہے ہیں مگر غریب جو دولت کا حاجت مند ہے لینے سے مسلسل انکار کر رہا ہے اور اپنے انکار پر معذرت کا خواہاں ہے کہ تحفہ رد کر کے دل نہیں دکھانا چاہتا ہوں ۔مگر مجبور ہوں ۔ آخرکار مجبوری معلوم کی جاتی ہے اور اس کی زبان سے وہ فقرہ نکلتا ہے جو انسانیت کا عنوان بن سکتا ہے۔ وہ کہتا ہے ''دولت لیتے ہوئے ڈرتا ہوں کہیں یہ دولت مجھ میں وہ مزاج نہ پیدا کر دے جس مزاج پر آپ نے ابھی ٹوکا ہے۔'' یہ ایک عام مسلمان کے خیالات ہیں صرف خیالات نہیں بلکہ عمل ہے جسے دولت بھی خرید نہیں سکتی لہٰذا معلوم ہوا کہ آج بھی اس دکھی دنیا کا علاج اسلام ہے اور صرف محمدؐ کا اسلام جس نے

کل درندہ عرب کو آدمی بنایا تھا آج وہ خونخوار یورپ اور امریکہ کو آدمی بنا سکتا ہے مگر کائنات کا سب سے عظیم نقصان یہ ہے کہ وہ اسلام آج ۷۳ فرقوں میں بٹا ہوا کہ اسلام دوسروں کے درد کا درماں کیسے بنے جو مسلمانوں کا درد سر بنا ہوا ہے۔ افسوس مسلمان کل کے جاہل عرب اور آج کے خونخوار یورپ و امریکہ کی طرح درندہ صفت ہے اس پر مزید یہ کہ اسلام کی تاریخ میں ایک فرقہ کا اسلام دوسرے فرقہ کے اسلام کے لیے خونخوار درندہ صفت نظر آ رہا ہے۔ لہٰذا آج اگر ایسی کوئی کوشش کی جاتی ہے جس سے وہ حقیقی اور اصلی اسلام معلوم ہو سکے جو عالم انسانیت کا نجات دہندہ تھا اور ہے اور اپنے نجات دہندہ ہونے کا کامیاب امتحان عرب کے عہد جاہلیت میں دے چکا ہے تو ایسی کوشش تخفیف اسلحہ کی قابل قدر کوشش سے ہزار گنا زیادہ ممدوح ہے اور فلاح انسانیت کے لیے اس زہریلے عہد میں تریاق کی حیثیت رکھتی ہے۔

مگر یہ اسلام معلوم نہ ہوگا جب تک اسلام کے تمام فرقوں کی چھان پھٹک نہ ہوگی۔ تحقیق مذہب کی اس مفید اور تریاق کوشش کو جب ''رواداری'' کی سولی پر پھانسی دی جاتی ہے اور سچے اسلام کو اجاگر کرنے کو جب ''فرقہ واریت'' پھیلانے کا مذموم الزام دیا جاتا ہے تو سسکتی انسانیت کی آہیں بلند ہوتی ہیں مگر کون دل ہے جو ان آہوں کو سنے۔ آہ انسانیت جو انسانوں کے ہاتھوں زندہ درگور ہے۔ کاش تیرا ہمدرد جلد ظہور کرتا۔

سچے اسلام کی تحقیق

اسلام آج دو بڑے فرقوں میں بٹا ہوا ہے۔ سنی اور شیعہ۔ دونوں فرقوں میں بھی بہت سے فرقے پائے جاتے ہیں۔ شیعوں میں زیدی، آغا خانی، بوہرہ اور اثنا عشری۔

اسی طرح سنی فرقہ کی بہت سی شاخیں ہیں۔اشعری،معتزلہ،صوفی،وہابی،حنفی وغیرہ۔لیکن شیعہ سنی کے درمیان حدفاصل اور بنیادی اختلاف ایک بات کا ہے۔''آنحضرتؐ کے بعد کون؟'' سنی نبوت کے بعد حکومت کے قائل ہیں۔شیعہ نبوت کے بعد امامت کے قائل ہیں۔سنی حضور کے بعد ابوبکر کو خلیفہ مانتے ہیں ان کے بعد سلسلہ خلافت مدینہ سے چل کر ترکی میں ختم ہوجاتا ہے۔شیعہ آنحضرتؐ کے بعد حضرت علیؑ کو امام اول اور خلیفہ اول تسلیم کرتے ہیں اور بارہ اماموں تک یہ سلسلہ چلتا ہے جو آج بھی ختم نہیں ہوا بلکہ بارہویں امام زندہ ہیں اور قیامت آنے تک زندہ رہیں گے سنی فرقہ کا اب کوئی نقطہ مرکزی نہیں رہا مگر شیعہ فرقہ کا مرکز اب بھی قائم ہے۔اسی ایک بات کے اردگرد دونوں فرقوں کا دین گردش کرتا ہے۔خلافت بمعنی حکومت نبوت والوہیت کو بھی اپنا جیسا جب ڈھال لیتی ہے۔نبی امت جیسے ہوجاتے ہیں۔خدا انسان جیسا سوچا جاتا ہے اور خلافت بمعنی امامت۔امت سے امام کو بلند اور امامت سے نبوت کو بلند اور الوہیت کے سامنے نبوت کو سجدہ ریز بناتی ہے پھر اخلاقی بلندیوں کی طرف بڑھنے اور چڑھنے کا نام اتباع مذہب قرار پاتا ہے۔غرضکہ سنی مذہب میں بشری کمزوریوں کو ہموار کرنے کے لیے نبوت اور الوہیت کو بھی بشریت کی طرف ڈھالو بنایا جاتا ہے۔اور شیعہ مذہب میں الوہیت کی بلندی سے نبوت کا سلسلہ قائم ہوتا ہے اور بلند نبوت سے امامت ہم رشتہ کی جاتی ہے۔اور ماننے والوں کو انسانی کردار کی بلندیوں کی معراج پر جانے کی دعوت دی جاتی ہے۔کھلے دماغ اور جذبات سے آزاد دل کے لیے اتنا ہی کافی ہے مگر سچے اسلام پر جو ۱۴سو سال کی تاریخ اسلام نے ملوکیت بنام خلافت الٰہیہ کا ملبہ ڈھیر کیا ہے۔اس ڈھیر کو ہٹانے اور سچے اسلام محمدی کو نظروں کے سامنے لانے کے لیے ضرورت ہے کہ اصلی اسلام کے آثار

قدیمہ کے لیے تحقیق کی گہری کھدائی کی جائے اسی کوشش کا ایک حصہ زیر کتاب ہے۔ حلب کے دو ممتاز سنی علماء جناب شیخ احمد امین انطا کی اور ان کے سگے بھائی شیخ محمد مرعی انطا کی آثار اسلام کی اس تحقیقی کھدائی میں کامیاب ہوئے ہیں۔دونوں نے اپنی محنت وکاوش کا ثمرہ پایا ہے لیکن بخل سے کام لینے کے بجائے انہوں نے اپنی محنت کو دو کتابوں میں لکھ کر دوسروں کے ہاتھوں میں دیدی ہے تاکہ ہر شخص فائدہ اٹھائے۔بڑے بھائی جو حلب کی یونیورسٹی جامعہ زکریا کے استاد ہیں ان کی کتاب ''فی طریقی الی التشیع'' کا ترجمہ پیش کیا جارہا ہے دوسری بھائی جو عالم، مدرس، خطیب اور پیش نماز تھے ان کی کتاب کا ترجمہ بھی ناظرین کے سامنے انشاء اللہ بوقت صحت وفرصت پیش ہوگا۔علامہ احمد امین انطا کی کی کتاب میں واقعات زیادہ ہیں اور مذہبی تحقیق کی بحث کم تھی لہٰذا مناسب معلوم ہوا کہ سچے اسلام یعنی اثنا عشری مذہب کی حقانیت کے لیے یہاں کچھ لکھا جائے۔

شیعہ اثنا عشری یعنی سچا اسلام

مذہب شیعہ اثنا عشری جو بارہ اماموں کا عقیدہ رکھتا ہے اس کی حقانیت کے لیے یہاں ۱۲ دلیلیں پیش کرنے پر اکتفا کی جاتی ہے۔ورنہ دلائل کی تعداد اتنی ہے کہ نہ سب لکھی جاسکتی ہیں اور نہ سب پڑھی جاسکتی ہیں اگر واقعی کوئی ناواقفیت کی نیند میں ہے تو یہ بارہ چھینٹے اسے بیدار بھی کردیں گے اور اس کے قلب ودماغ میں دین حق کی زراعت کو بارآور بھی کردیں گے لیکن جو جاگ رہا ہے مگر مصلحت وخودغرضی وتعصب نے اسے سوتا بننے پر آمادہ کیا ہے اسے تو صور قیامت بھی صحیح مذہب تک نہ لاسکے گا چہ جائیکہ یہ نرم ونازک کلام سچ ہے۔

کہاں پھول کی پتی اور کہاں پتھر کا جگر

بزم تحقیق میں بارہ نورانی شمعیں روشن کی جارہی ہیں جبکہ صدر محفل خود آنحضرتؐ ہیں شب کور، وروز کور آنکھوں کی خیرگی سے معذرت کے ساتھ کھلی آنکھوں کے لیے خزانہ نور پیش کیا جارہا ہے۔

وماتوفیقی الا باللہ۔

سمجھنے کی بات

آج اصول، عقائد، اعمال اور فروع غرض ہر چیز میں اختلاف پائے جاتے ہیں۔ خدا کو سب مانتے ہیں مگر خدا کے اوصاف میں ایک دوسرے سے اختلاف رکھتے ہیں۔ آنحضرتؐ اور انبیاء ماسبق کو مان کر بھی مسلمان معنی نبوت، معیار نبوت، کردار نبوت میں اختلاف رکھتے ہیں۔ قرآن کو بے معنی و بے ترجمہ سب مانتے ہیں مگر معنی ومطلب میں ہر ایک الگ الگ اپنا ترجمہ کرتا ہے اور اپنی تفسیر بیان کرتا ہے۔ نماز کو سب مانتے ہیں مگر سب کی نمازوں کی شکل وطریقہ جدا ہیں۔ وضو کا طریقہ بھی ایک نہیں۔ روزہ رکھنے والے بھی روزہ کھولنے میں اپنے اپنے وقت کے پابند ہیں۔ کسی کا روزہ پہلے کھلتا ہے کسی کا بعد میں حج میں سب جمع ہوتے ہیں مگر احکام حج ایک نہیں۔ لہٰذا سوچنے والی بات یہ ہے کہ تمام اختلافات کے بعد سب مسلمان اس اسلام کو نہیں مانتے ہیں جس اسلام کو حضورؐ نے پیش کیا تھا۔ ہر فرقہ کا طرز عمل سیرت رسولؐ کے مطابق نہیں ہوسکتا۔ حضور اگر وضو میں مسح کرتے تھے تو پیر نہ دھوتے ہوں گے۔ ہاتھ کہنی سے انگلیوں کی طرف دھوتے تھے۔ تو

الٹے ہاتھ نہ دھوتے ہوں گے۔ روزہ اگر اہلسنت کے وقت پر کھولتے تھے تو شیعوں کا وقت زیادہ ہے اور اگر شیعوں کا وقت آپ کے وقت کے مطابق ہے تو سنی وقت سے پہلے روزہ کھول ڈالتے ہیں۔ اگر آپ کی نظر میں نبی گناہ صغیرہ وکبیرہ، خطا، سہو، نسیان سے پاک اور بلند مرتبہ ہوتا ہے تو سنیوں کا عقیدہ نبوت فاسد ہے ورنہ شیعہ نبی کو اس کی حیثیت سے زیادہ بلند مان رہے ہیں۔ اگر خدا کے لیے ظلم جائز ہے تو سنی ٹھیک کہتے ہیں اور شیعہ خدا کو ہر عیب سے بلند مان کر اپنے عقیدہ کو بے سبب اونچا کر رہے ہیں اور اگر خدا ہر عیب سے پاک ہے تو خدا پر الزام ظلم لگا کر سنی خدا پر ظلم اور اپنے لیے خطرہ مول لے رہے ہیں۔ غرضکہ اختلاف کے ہوتے ہوئے ہر فرقہ درست اور سچے اسلام پر نہیں ہوسکتا ہے شیعہ سچے ہیں تو سنی مذہب باطل ہے۔ سنی مذہب حق ہے تو شیعہ مذہب غلط دونوں کسی طرح صحیح اور سچے نہیں ہوسکتے۔ البتہ یہ ممکن تھا کہ اختلاف کے ہاتھوں آج کے تمام فرقے غلط ہوتے سب کو کسی نہ کسی اختلاف نے اسلام محمدی سے ہٹا دیا ہوتا۔ جس کے معنی یہ ہوتے کہ آنحضرتؐ نے جو کوشش کی تھی بلکہ خدا نے آنحضرتؐ کے ذریعہ جو کوشش کی تھی وہ ناکامیاب ہوکر ختم ہوچکی اور آج شیطان بلا مقابلہ کامیاب ہے۔ لیکن حقیقت اس کے خلاف ہے۔ اسلام اختلافات میں ضرور مبتلا ہوا لیکن ان اختلافات کے باوجود اصل اسلام پر کوئی نہ کوئی فرقہ باقی ہے اور سچے اسلام کے مطابق ایک فرقہ کا ہونا اس لیے ضروری ہے کہ خدا نے نبوت ختم کردی۔ اب کوئی نبی سچا مذہب پیش کرنے کے لیے نہیں آنے والا ہے۔ لہٰذا اگر حضور کے بعد سچا اسلام بالکل مٹ جانے والا ہوتا تو خدا سلسلۂ نبوت کیسے ختم کرسکتا تھا۔ خدا اسلام کو پیش آنے والے واقات سے باخبر تھا۔ اس نے انتظام کیا کہ اصلی اسلام باقی رہے۔ اور میر کاروان ہدایت جناب ختم المرسلین کو ان

واقعات کی اطلاع دی اور آپ کے ذریعہ سچے مذہب کے استحکام وبقا کا انتظام کیا۔

چنانچہ آپ نے امت کو خبردار کیا کہ میرے بعد تم میں فتنہ پیدا ہوں گے اور فتنوں کی خبر اس کثرت سے دی کہ صحیح بخاری اور صحیح مسلم میں ایک پورا باب ہے۔ ''کتاب الفتن'' کاش امت آپ کی ان پیشن گوئیوں سے سبق لیتی اور اپنے کو اختلافات سے بچانے کی کوشش کرتی تو آج اسلام کا یہ حال نہ ہوتا۔ آپ نے پیدا ہونے والے فتنوں کی خبر اس کثرت سے دی تھی کہ ملا علی متقی نے کنز العمال کی جلد/۶ میں بذیل کتاب الفتن ص/۲۷ سے ۹۲ تک حدیث ۴۴۱ سے ۱۳۹۰ تک نو سو پچاس حدیثیں جمع کی ہیں جس میں سے حدیث ۴۷۷ اختلافات کے پیداوار کے سبب کی تشریح کرتی ہے۔ ان بعدی ائمۃ اطعتموھم اکفروکم وان عصیتموھم قتلوکم ائمۃ وروس الضلالہ۔ میرے بعد کچھ امام ہوں گے ان کو مانوں گے تو تم کو کافر بنا دیں گے نہ مانو گے تو قتل کر دیں گے یہ کفر کے امام اور گمراہی کے سردار ہوں گے۔

یہ حدیث تاریخ اسلام کے خلفاء پر حرف بحرف صادق آرہی ہے۔ کاش اسلام نے ان خلفا کے بجائے ائمہ اہلبیتؑ کو اپنا امام بنایا ہوتا۔ ان فتنوں کے ساتھ حضورؐ نے یہ خبر بھی دی تھی کہ ایک فرقہ گمراہ نہ ہوگا وہ جنتی ہوگا باقی تمام فرقے دوزخ میں جائیں گے۔ ملاحظہ ہو ملل ونحل شہرستانی حصہ اول ص/۵، مطبعہ ادبیہ مصر۔

''کہ میرے بعد میری امت میں ۷۳ فرقہ ہوں گے جو سب دوزخ میں جائیں گے صرف ایک فرقہ دوزخ سے بچے گا جو جنت میں جائے گا۔''

ضرور ہے کہ ہم اس فرقہ کو حضورؐ کے ارشادات کے ذریعہ معلوم کریں۔ اسی فرقہ کو معلوم کرنے کے لیے یہاں بارہ دلیلیں لکھی جارہی ہیں۔

(۱) عہد رسالت میں کون فرقہ موجود تھا

عہد پیغمبر میں بھی اسلام ایک نہ تھا ورنہ سورہ مومن اور سورہ منافقون دوسورے نہ نازل ہوتے، منافق گمراہ اور مومن حضورؐ کے ماننے والے تھے۔ آج اگر معلوم کرنا ہے کہ شیعہ وسنی کونسا فرقہ جنتی اور سچا ہے تو ہم کو معلوم کرنا ہوگا کہ عہد پیغمبر میں کون سا فرقہ مومن تھا۔ جو فرقہ آپ کے عہد میں تھا وہ حق پر ہے خصوصاً جبکہ اس فرقہ کے جنتی ہونے کے بارے میں حضور نے گواہی بھی دی ہو۔

تفسیر در منشور جلال الدین سیوطی جلد/۳۷۹، مطبوعہ مصر۔

بذیل آیہ: ھم خیر البریہ۔ پارہ ۳۰، سورہ۔ لم یکن الذین کفروا۔

عن جابر بن عبداللہ قال کنا عند النبی فاقبل علیؑ فقال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم قد اتاکم اخی ثم التفت الیٰ الکعبہ فضربھا بیدہ ثم قال والذی نفسی بیدہ انا وھٰذا وشیعتہ ھم الفائزون یوم القیامۃ۔

''جابر کہتے ہیں ہم لوگ آنحضرتؐ کی خدمت میں حاضر تھے کہ حضرت علیؑ تشریف لائے آنحضرتؐ نے فرمایا میرا بھائی آیا پھر کعبہ کی طرف متوجہ ہوئے اور دیوار کعبہ پر ہاتھ مار کر فرمایا خدا کی قسم میں اور یہ علیؑ اور ان کے شیعہ ہی قیامت کے دن کامیاب ہوں گے۔''

کیا اس واضح حدیث کے بعد بھی کسی کو شیعہ علیؑ کے جنتی فرقہ ہونے میں شبہ ہوسکتا ہے۔ اور اس حدیث سے زیادہ کسی واضح دلیل کی ضرورت ہے کہ حضورؐ کے زمانہ

میں شیعہ موجود تھے۔ اگر نہ تھے تو جب صرف حضور اور حضرت علیؑ اور ان کے شیعہ ہی جنتی ہیں تو عہد پیغمبر میں نبیؐ اور علیؑ کے علاوہ کیا کوئی شخص جنتی نہ تھا؟ تھے اور صرف مومن تھے جو شیعہ علیؑ تھے۔

قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم لعلی بن ابی طالب لایحبک الا مومن و لا یبضک الا منافق۔

"حضرت علیؑ کے لیے حضورؐ نے فرمایا اے علیؑ تم سے صرف مومن محبت کرے گا اور تمہارا دشمن صرف منافق ہوگا۔

(ترمذی ص/۵۳۳، اصابہ ص/۵۰۹ ج/۲، مشکوٰۃ المصابیح ص/۲۶۳، طبع لکھنؤ ۱۳۱۹ھ)

معلوم ہوا کہ عہد پیغمبر میں مسلمان دو طرح کے تھے مومن اور مناق اور دونوں کی تقسیم اس طرح تھی علیؑ کا دوست مومن۔ علیؑ کا دشمن منافق۔ اور حضور نے علیؑ کے دوست کو شیعہ اور جنتی و کامیاب قرار دیا ہے بات واضح ہے مگر مزید تسکین وتشریح کے لیے یہ بھی جان لینا مناسب ہوگا کہ اہل سنت و جماعت نام کا کوئی فرقہ زمانہ پیغمبرؐ میں نہ تھا۔ بلکہ آپ کے عہد میں صرف دو طرح کے مسلمان تھے مومن و منافق۔ مومن علیؑ کے شیعہ اور منافق علیؑ کے دشمن اور ان دشمنوں ہی کی وجہ سے جناب امیرؑ کو ۲۵ سال تک خلافت نہ مل سکی جب ملی بھی تو ان دشمنوں نے جمل، صفین اور نہروان میں آپ کے خلاف مسلح بغاوت کی۔ دشمنی کا یہ سلسلہ چلتا رہا۔ یہاں تک کہ حضرت علیؑ شہید ہوئے اور دشمنوں کی کثرت نے امام حسن علیہ السلام سے خلافت لے لی۔ جب علیؑ کے دشمنوں کو خلافت علیؑ و اولاد علیؑ کے خاتمہ کا یقین واطمینان ہوا تو انہوں نے اپنی کامیابی کے سنہ کا نام سنہ

جماعت رکھا تاریخ خمیس ج/۲، ص/۳۲۵ ذیل خلافت معاویہ۔ تاریخ الخلفاء ص/۱۳۶ حالات معاویہ مطبوعہ قیومی کانپور، استیعاب ترجمہ معاویہ ج/۱، ص/۱۶۲ احرف میم) عترت کے مقابلہ میں سنت کا نام بلند کیا گیا اور اس طرح یہ اس فرقہ کے جدید نام کی تشکیل ہوئی۔ اہل سنت و جماعت عہد پیغمبر میں اس فرقہ کا نام اور کام کیا تھا اگر صرف یہی بات ذہن محسوس کرلیں تو حق کا واضح راستہ معلوم ہوجائے۔

(۲) گمراہی سے پاک فرقہ

حضور نے پیشن گوئی فرمائی مسلمانوں میں ۷۳ فرقہ پیدا ہوں گے اور پیشن گوئی سچی نکلی کہ فرقہ پیدا ہوئے پیشن گوئی کا بقیہ حصہ (یعنی سب دوزخ میں جائیں گے ایک فرقہ جنت میں جائے گا) بھی صحیح رہے گا۔ جنت کے طالب مسلمان کا فرض ہے کہ اس فرقہ کو معلوم کرے۔ ظاہر ہے کہ یہ فرقہ گمراہی سے محفوظ ہوگا اور باقی تمام فرقے اسلام کا نام لینے کے بعد بھی گمراہ ہوں گے۔ وہ کون فرقہ ہے جو گمراہی سے محفوظ ہے اسے بھی نبیؐ سے معلوم کرلیجئے۔ ملاحظہ ہو: حدیث ثقلین جس کے راوی ۳۶/اصحاب پیغمبر ہیں اور جسے ۱۸۵ علماء اسلام اپنے بیان اور مصنفات میں نقل کرچکے ہیں تفصیل کے لیے عبقات الانوار (حدیث ثقلین ملاحظہ ہو) اس حدیث میں حضور نے وضاحت سے فرمایا تھا۔

"میرے بعد جو شخص قرآن اور میری عترت اہل بیتؑ سے متمسک رہے گا وہ ہرگز گمراہ نہ ہوگا۔"

(مسند احمد بن حنبل ج/۴، ص/۳۶۷۔۳۷۱، ج/۵، ص/۱۸۲۔۱۸۹، صواعق

محرقہ الباب الحادی عشر ص ۸۹، جلال الدین سیوطی کی تفسیر درمنثور بذیل آیہ مودة وبذیل
آیہ واعتصموا بحبل اللہ جمیعاً وغیرہ ملاحظہ کیجیے۔)

لہٰذا صرف قرآن اور اہلبیت علیہم السلام کا ماننے والا فرقہ جنتی ہے۔ کیا شیعہ
فرقہ کے علاوہ کوئی دوسرا اسلامی فرقہ ہے جو اپنے لیے یہ دعویٰ بھی کر سکے کہ ہم قرآن
واہلبیت علیہم السلام کے ماننے والے ہیں اور ان کے علاوہ کسی کو نہیں مانتے۔

(۳) اسلام میں کھلی گمراہی کا آغاز!

زمانہ گذشتہ کا مصلح اور زمانہ آئندہ کا ہادی جب بستر علالت پر موت کی طرف
بڑھ رہا تھا تو آپ کو ہدایت کے مستقبل کو اندھیرے سے بچانے اور تابان رکھنے کی فکر تھی
ہادی عالم کو اس سے بڑی کوئی دوسری فکر نہ تھی اور نہ ہو سکتی تھی۔ خصوصاً جب آپ کے علم
میں تھا کہ اسلام میں کثرت سے گمراہ فرقہ پیدا ہوں گے۔ یہی اسباب تھے جو علالت میں
آپ کو بیکل کئے تھے اور یہی وہ فکر تھی جس نے آپ کو ہر فکر سے دامن کشی بنا دیا تھا۔ چنانچہ
آپ نے اپنے انتقال سے ۴ دن پہلے یعنی زندگی کی آخری جمعرات کے دن اصحاب
کے سامنے فرمایا:

''سامان کتابت لاؤ تا کہ میں ایسی تحریر لکھ دوں جس کے بعد تم گمراہ نہ ہو۔''

مگر بجائے پیغمبر کی اس خواہش کے استقبال کرنے اور خوش آمدید کہنے کے
اصحاب نے مخالفت کی اور مخالفت میں سب سے آگے حضرت عمر تھے۔ جنہوں نے حضور
کے ذہن کو بیماری سے متاثر اور آپ کی خواہش تحریر ہدایت کو ہذیان قرار دیا۔ مجمع کے شور
وغوغا سے تنگ آ کر حضور نے سب کو اپنے پاس سے اٹھا دیا۔ یہ واقعہ اتنا دردناک اور

دلدوز تھا کہ جناب ابن عباس جو صحابی پیغمبر اور رشتہ دار پیغمبر ہیں۔ جن کی احادیث سے
کتب صحاح واحادیث وتفاسیر بھری پڑی ہیں کثرت علم کے باعث آپ کا لقب ''حبر
امت'' تھا۔ آپ جب کبھی بھی زندگی میں اس واقعہ کو یاد کرتے تھے تو اتنا روتے تھے کہ
زمین تر ہو جاتی تھی۔ کیا کوئی دیانت دار مسلمان پیغمبر کی خواہش ہدایت کی مخالفت کی کوئی
معقول وجہ بتا سکتا ہے۔ اگر یہ تحریر لکھ جاتی اور مسلمان اس پر عمل کرتے تو آج صرف
اسلام ہوتا۔ اختلافات نے اسلام اور مسلمان کو آج تک جتنی زحمتوں اور مصیبتوں میں
ڈالا ہے اور کل قیامت تک جتنی تکلیفیں پیدا ہوں گی، ان سب کے ذمہ دار حضرت عمر اور
ان کے ساتھی ہیں جنہوں نے حضورؐ کی مخالفت کی اور اتنی تند و تیز مخالفت جو حدود وتہذیب
وایمان سے گذر گئی۔ سوچئے مسلمان اور ترجمان وحی نبیؐ کی بات کو ہذیان کہے اور آج بھی
مسلمان، کہنے والے کو نہ صرف مسلمان مانیں بلکہ اپنا اخروی سردار تسلیم کریں۔

نبی کیا لکھتے اگر یہ بات معلوم نہ ہوتی تو مخالفت نہ ہوتی۔ اور مخالفت سے پتہ
چلتا ہے کہ نبی جو کچھ لکھنے والے تھے وہ مخالفت کرنے والے کے مفاد کے لیے نہ صرف
مضر تھا بلکہ حضرت عمر کے مفاد ومستقبل کو معدوم کرنے کا یقینی وقطعی سبب تھا ورنہ حدود
ایمان سے گذری ہوئی مخالفت دعویٰ اسلام کے ساتھ کوئی مسلمان اور وہ بھی مسلمانوں
کے مجمع میں نہ کرتا۔ مگر وقت وہ آ گیا تھا کہ حضرت عمر کو خاموشی ان کی حکومت حاصل
کرنے کی خواہش اور اس خواہش کے مفاد ومستقبل کی موت کے مترادف تھی۔ نبیؐ کیا
لکھنے والے تھے اور کیسے لکھنے سے پہلے حضرت عمر کو معلوم ہو گیا کہ یہ تحریر ان کو حکومت نہ
بنانے دے گی۔ اس کے سمجھنے میں آج بھی کوئی دقت نہیں ہے۔ حضرت نے تحریر کے لیے
وضاحت کی تھی کہ یہ تحریر وہ ہوگی جس کے بعد تم گمراہ نہ ہو سکو گے۔ اسی فقرہ نے بتلا دیا

کہ حضور کیا لکھنے والے ہیں کیونکہ آپ برابر فرماتے رہے تھے کہ قرآن اور اہلبیتؑ سے وابستہ رہنے والا گمراہ نہ ہوگا۔ گمراہ نہ ہوگا کے فقرہ کے اتحاد نے حضرت عمر کو قبل تحریر مفہوم تحریر بتلا دیا۔ اسی لیے آپ نے قرآن کی حمایت اور اہل بیتؑ کی مخالفت کی۔ حالانکہ پیغمبر دونوں کو ایک دوسرے کا ساتھی بتا رہے تھے جن میں جدائی ممکن نہیں۔ حضرت عمر مخالفت میں اپنی جماعت کے سہارے کامیاب ہوئے جو ظاہر ہے مومن کی جماعت نہیں ہوسکتی تھی۔ نہ صرف مخالفت میں کامیاب ہوئے بلکہ وفات پیغمبر کے بعد خلافت ساز بھی ہوئے۔ نہ صرف خلافت ساز ہوئے بلکہ خلافت یعنی ملوکیت کے نظریہ ساز بھی ہوئے اور آنے پورے نبوتی اسلام کو ملوکیتی اسلام کے سانچہ میں اپنے نظریات کے ذریعہ ڈھال لیا آج مسلمان اسی سانچہ سے اپنے کو نہیں نکال پاتا ہے جس کا نتیجہ ہے کہ مسلمانوں میں گمراہ فرقوں کی پیداوار آج بھی جاری ہے اگر یہ مخالفت نہ ہوتی تو اسلام ایک ہوتا جو آل محمد کا اسلام ہوتا مگر اختلافات کے باوجود بھی آج یہ حقیقت واقعات مذکورہ بالا کی روشنی میں واضح ہے کہ گمراہی سے پاک اسلام اور جنت میں جانے والا فرقہ صرف ایک ہے شیعہ یعنی آل محمدؐ کے مذہب کے پیرو۔

مذکورہ بالا واقعات کے لیے حسب ذیل کتاب ملاحظہ ہوں جو اہل سنت کی معتبر ترین کتابیں ہیں۔

(۱) مشکوٰۃ۔ باب وفات النبی۔ فصل ثالث۔ ص/۵۴۰، مطبوعہ گلزار محمدی لاہور ۱۳۱۳ھ۔

(۲) صحیح بخاری باب مرض النبی ج/۳، ص/۵۸، مطبوعہ میمینہ مصر۔

(۳) مسند احمد ابن حنبل۔ باب مسند ابن عباس ج/۱، ص/۲۲۲۔

(۴) نسیم الریاض ج/۴، ص/۲۷۸۔

(۵) ملل ونحل شہرستانی ج/۱، ص/۱۹، مطبوعہ ادبیہ مصر ۱۳۱۷ھ۔

(۴) گمراہی سے بچنے کا واحد راستہ!

حضور کی مخالفت میں حضرت عمر نے اہلبیتؑ کی مخالفت کی تھی اور قرآن کی حمایت کی تھی جس سے آج تک یہ غلط فہمی پائی جاتی ہے کہ اہلبیتؑ کو چھوڑنے والا گمراہ نہیں ہوسکتا مگر حضور نے اپنی مشہور حدیث میں وضاحت کر دی تھی کہ اہلبیتؑ کو چھوڑنے والا چاہے وہ کسی سے بھی اپنے کو وابستہ رکھے گمراہ اور ہلاک ہوگا۔ حضور فرماتے ہیں:

''میرے اہل بیت کی مثال جناب نوح کی کشتی کی مثال ہے جو شخص اہلبیتؑ کی کشتی میں آ جائے گا اس کی نجات ہوگی۔ جو اس کو چھوڑے گا وہ غرق وہلاک ہوگا۔''

(ملاحظہ ہو صواعق محرقہ ص/۱۱۱، باب حادی عشر، ینابیع المودۃ ص/۲۰۳، باب/۵۶)

اس حدیث کے معنی ومطالب پر معمولی غور بھی ہر مسلمان کو سچے اسلام کی طرف رہبری کرنے کے لیے کافی ہے۔ حضورؐ نے اپنے اہلبیتؑ کو کشتی جناب نوحؑ سے تشبیہ دے کر اس حقیقت کو بیان فرما دیا تھا کہ جس طرح طوفان سے صرف وہی لوگ بچے جو کشتی میں تھے۔ اور جو کشتی میں نہ تھا وہ ڈوبا اور ہلاک ہوا اسی طرح طوفان عذاب سے صرف وہی شخص بچے گا جو کشتی اہلبیتؑ میں ہوگا اور جو بھی چھوڑ دے گا وہ ہلاک ہوگا۔ بات صاف تھی مگر علم غیب کے مالک پیغمبرؐ کے پیش نظر وہ تاویلیں اور بحثیں تھیں جن کو مسلمان پیش کر کے حدیث کو اس کے مفہوم سے الگ کرتے۔ لہٰذا آپ نے صاف بیان کی اس آخری حد تک وضاحت کی کہ اب یہ کہنا تو ممکن ہوسکتا ہے چاہے وہ کتنا بڑا

جھوٹ کیوں نہ ہو کہ یہ حدیث حضورؐ کی نہیں ہے لیکن یہ کہنا ناممکن ہے کہ اس حدیث کے بعد سوائے اہل بیتؑ کے مذہب کے کوئی دوسرا مذہب نجات کا ذریعہ نہیں بن سکتا ہے۔

چنانچہ آپ نے مثال وتشبیہ کے بعد تشبیہ کے نتیجہ کی وضاحت فرمائی کہ جو سفینہ اہلبیتؑ میں ہوگا وہ نجات پائے گا مگر بات ختم نہ کی بلکہ منفی پہلو بھی بتلایا کہ جو چھوڑ دے گا وہ غرق وہلاک ہوگا کیونکہ مثبت پہلو تک کہنا ممکن تھا۔ بے شک اہلبیتؑ ذریعہ نجات ہیں مگر قرآن بھی ذریعہ نجات ہے۔ صرف عقیدہ نبوت وتوحید بھی ذریعہ نجات ہے وغیرہ وغیرہ مگر منفی پہلو کے بعد اب حدیث کے معنی یہ نہیں ہیں کہ ''اہلبیتؑ بھی ذریعہ نجات ہیں'' بلکہ اس کے معنی ہیں ''اہلبیتؑ ہی ذریعہ نجات ہیں'' جو اہلبیتؑ کو چھوڑ دے چاہے وہ نمازی ہو، حاجی ہو، حافظ ہو، قریشی ہو، غیر قریشی ہو، مہاجر ہو، انصار ہوں، ازواج ہوں، مجاہد ہوں، صحابی ہوں، خلفاء وبادشاہ ہوں یا عوام اور رعیت، اہلبیتؑ کو چھوڑ نے والا کسی ذریعہ نجات کو نہیں حاصل کر سکتا ہے۔ کیونکہ جب طوفان نوحؑ آیا تو ہدایت کا تمام ذخیرہ یعنی خود جناب نوحؑ عام مومنین مذہب الٰہی وغیرہ سب کچھ سفینہ کے اندر تھا اور صرف سفینہ میں آنے والے ہی کو سب چیزیں مل سکتی تھیں۔ جو سفینہ چھوڑے وہ صرف سفینہ نہیں چھوڑتا بلکہ اس سے مومنین، مذہب الٰہی، جناب نوحؑ غرضکہ ہدایت کی ہر چیز چھوٹ جاتی تھی۔ اسی طرح جو دامن اہل بیت علیہم السلام چھوڑے گا وہ صرف اہل بیت علیہم السلام کو نہ چھوڑے گا بلکہ اس سے نبیؐ، قرآن، سچا اسلام سب کچھ چھوٹ جائے گا۔ اور جو ان کو مان لے گا اسے سب کچھ مل جائے گا۔ رحمت الٰہی، منتظر ہے اب کام طالب رحمت کا ہے کہ وہ در رحمت پر آئے۔

(۵) حق وباطل کی حد فاصل!

حضورؐ نے افتراق امت کی خبر جس حدیث میں دی تھی کہ ''میرے بعد میری امت میں ۷۳ فرقہ ہوں گے جن میں ایک جنت میں جائے گا اور باقی سب دوزخ میں جائیں گے۔'' اس حدیث کا حوالہ نقل کیا جا چکا ہے۔ اس حدیث میں قابل غور بات یہ ہے کہ آپ نے ''امت'' کے گمراہ فرقوں کو دوزخی بتلایا ہے۔ اگر ہم معنی امت معلوم کرلیں تو حدیث کا مفہوم واضح ہو جائے۔ بات آسان ہے مثالوں سے معلوم کر لیجئے۔ جو شخص خدا کا منکر ہے اسے کوئی مسلمان امت پیغمبر میں شامل نہیں مانے گا۔ دوسرا شخص جو خدا کا اقرار مگر حضورؐ کی نبوت کا منکر ہو وہ بھی امت سے خارج ہے۔ خدا ورسول کو ماننے والا مگر قرآن کو کتاب الٰہی نہ ماننے والا امت سے باہر ہے۔ خدا ورسول وقرآن وقبلہ کو ماننے مگر کعبہ کو قبلہ نہ ماننے والا بھی امت میں شمار نہیں ہوتا۔ خدا ورسولؐ وقرآن وقبلہ کو مان کر اگر کوئی نماز یا روزہ یا حج کو مثلاً مہمل اور لغو کہتا ہے تو وہ بھی خارجی ہے کیونکہ کسی حکم خدا ورسولؐ کو مہمل ولغو کہنے والا حکم دینے والے خدا اور حکم لانے والے رسولؐ پر معاذ اللہ مہمل ولغو ہونے کا الزام لگاتا ہے۔ ان مثالوں کی روشنی میں معلوم کیجئے کہ امت کے معنی کیا ہوئے تو نتیجہ یہی نکلے گا کہ جو شخص خدا اور رسولؐ وقرآن وقبلہ ونماز وروزہ وحج وغیرہ کا ماننے والا ہوگا وہ امت میں شامل اور شمار ہوگا۔ اور حضورؐ نے امت کے ۷۲ فرقوں کو گمراہ ودوزخی قرار دیا ہے۔ یعنی ۷۲ فرقہ خدا، رسولؐ، قرآن، قبلہ، نماز، روزہ، حج وغیرہ کو مانیں گے مگر پھر بھی دوزخ میں جائیں گے۔ اور ایک فرقہ ان باتوں کو مانے گا مگر جنت میں جائے گا۔ دونوں باتیں سامنے رکھنے کے بعد ہر شخص اس بات کو تسلیم کرلے گا کہ ان عام باتوں کے

ما سوا کوئی ایسا عقیدہ و مسئلہ اسلام میں ہے کہ اگر اسے نہ مانا جائے تو سب کچھ ماننے کے بعد بھی دوزخ ٹھکانہ ہے اور اگر وہ بات بھی مان لی جائے تو جنت ملتی ہے۔ ماحصل کلام یہ ہے کہ اسلام کے اس عقیدہ کو معلوم کرنا ہمارا فرض ہے جس کی صفت و حالت یہ ہے کہ مسلمان سب کو مانے مگر اس کو نہ مانے تو گویا اس نے کچھ نہیں مانا اور اگر اسے مان لے تو جو کچھ مانا ہے سب کا ماننا کارآمد اور نتیجہ خیز ہو جائے۔ وہ عقیدہ کیا ہے اسے قرآن کی روشنی میں معلوم کریں۔

يَـاأَيُّهَـا الـرَّسُـولُ بَلِّغْ مَا أُنزِلَ إِلَيْکَ مِنْ رَبِّکَ وَإِنْ لَمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَهُ وَاللّٰهُ يَعْصِمُکَ مِنَ النَّاسِ.

''اے رسولؐ اس پیغام کو پہنچا دو جو پیغام تم کو تمہارا رب دے چکا ہے۔ (اگرچہ تم رسالت کے فرائض بہت کچھ انجام دے چکے ہو مگر اس کے باوجود) اگر تم نے یہ پیغام نہ پہنچایا تو گویا رسالت کے فرائض ادا ہی نہیں کئے۔ (اس پیغام کے پہنچانے میں اگرچہ تمہاری جان کا خوف ہے مگر بے خوف ہو کر پیغام پہنچاؤ) خدا دشمنوں سے تم کو محفوظ رکھے گا۔''

معلوم ہوا اس آیت میں اس حکم کا ذکر ہے کہ اگر حضور یہ حکم امت تک نہ پہنچاتے تو جتنے حکم پہنچا چکے تھے سب کا پہنچانا بے کار تھا اور اگر یہ حکم پہنچا دیں تو جتنے حکم پہنچائیں سب کا پہنچانا کارآمد ہو جائے لہٰذا یہی حکم وہ ہے کہ اگر مسلمان اسے نہ مانے تو سب کا ماننا بے کار ہے اور اگر اسے مان لے تو سب کا ماننا کارآمد ہو جائے۔ مذہب جو جنت تک لے جائے گا اس کے معلوم ہونے میں صرف اتنا معلوم کرنا باقی ہے کہ اس آیت کے نازل ہونے کے بعد حضورؐ نے کون سا حکم پہنچایا۔ شیعہ کتابیں متفق ہیں کہ

حضور نے ۱۰ ہجری کی ۱۸/ذی الحجہ کو غدیر خم کے مقام پر اس آیت کے اترنے کے بعد حضرت علی علیہ السلام کی خلافت کا پیغام پہنچایا۔ حضرت کی خلافت بلافصل وہ مسئلہ ہے کہ اگر صحیح ثابت ہو جائے تو فرقہ شیعہ کا حق ہونا اور سنی مذہب کا باطل ہونا طے ہو جاتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں جناب امیرؑ کی خلافت بلافصل، سنی مذہب کی شہ رگ حیات کو قطع کرتی ہے لہٰذا جس مسئلہ سے سنی مذہب اپنا وجود کھو بیٹھتا ہے اس مسئلہ کا ثبوت اگر علماء اہل سنت کی معتبر، مقبول کتابوں میں مل جائے تو پھر انکار کا محل عقل و ہوش کی سلامتی کے ساتھ ناممکن ہے۔ کیونکہ اگر شیعوں نے غدیر خم کی روایت مصنوعی اور جعلی بنائی ہوتی تو سنی کتاب میں اس کا ذکر نہ ہوتا۔ اس کے برخلاف یہ روایت واقعہ اور حقیقت ہے لہٰذا سنی کتابوں سے کھرچنے کے بعد بھی سنی کتابوں میں پایا جانا اس کی حقانیت کا عظیم ثبوت ہے۔ ملاحظہ ہو:

''**يَـاأَيُّهَا الرَّسُولُ بَلِّغْ مَا أُنزِلَ إِلَيْکَ مِنْ رَبِّکَ وَإِنْ لَمْ تَفْعَلْ فَمَا بَـلَّغْتَ رِسَالَتَهُ وَاللّٰهُ يَعْصِمُکَ مِنَ النَّاسِ**'' نازل ہوئی اور حضورؐ نے حضرت علیؑ کا ہاتھ پکڑ کر کہا جس کا میں مولیٰ ہوں علیؑ بھی اس کے مولا ہیں۔'' (اسباب النزول واحدی، ص/۱۵۰، مطبوعہ عمدۃ القاری شرح صحیح بخاری، ج/۸، ص/۵۸۴، مطبوعہ اسلامبول، تفسیر در منشور جلال الدین سیوطی ج/۲، ص/۲۹۸، مطبوعہ میمنیہ مصر)

معلوم ہوا جو فرقہ حضرت علیؑ کو خلیفہ بلافصل نہیں مانتا ہے وہ سب کچھ مان کر گویا کچھ نہیں مانتا لہٰذا اس کا ٹھکانہ دوزخ ہے اور یہی امت پیغمبر کے وہ فرقے ہیں جن کی خبر حضورؐ نے دی ہے۔ اور جو حضرت علیؑ کی خلافت بلافصل مانتا ہے وہی فرقہ جنتی ہے اور یہی سب کچھ ماننے والا ہے شیعہ اور صرف شیعہ وہ فرقہ ہے جو خلافت بلافصل حضرت

امیر علیہ السلام کا ماننے والا ہے۔

(٦) کامل دین کون ہے؟

حضور کے ارشاد کے مطابق مسلمانوں کے فرقوں میں ایک فرقہ جنت میں جائے گا باقی دوزخ میں یعنی ایک فرقہ کے اسلام کو خدا قبول کرے گا اور اس پر نعمتوں کی بارش ہوگی اور اس کا دین کامل ہوگا۔ باقی دوزخ میں جانے والے تمام اسلامی فرقوں کا دین ناقص ہوگا۔ خدا ان کے اسلام کو قبول نہ کرے گا اور ان کو اسلام کے باوجود نعمتیں نہ حاصل ہوں گی۔ قرآن کی ایک آیت پتہ دیتی ہے کہ اسلام کی تاریخ میں ایک دن کوئی اہم حکم نازل ہوا تھا جس حکم کے بعد خدا نے دین کو کامل قرار دیا تھا۔ اور اس حکم کے ماننے والے کے اسلام کو قبول کیا تھا۔ اور اس حکم کے ماننے والے پر خدا نے اپنی نعمتیں تمام کر دی تھیں۔

الْيَوْمَ أَكْمَلْتُ لَكُمْ دِينَكُمْ وَأَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِي وَرَضِيتُ لَكُمُ الْإِسْلَامَ دِينًا.

''مسلمانو آج میں نے تمہارے لیے تمہارا دین کامل کر دیا۔ اور آج تم پر اپنی نعمتیں تمام کر دیں، اور آج اسلام کو تمہاری دین کی حیثیت سے میں نے پسند وقبول کیا۔''

اگر معلوم ہو جائے کہ یہ کس دن کا واقعہ ہے اور اس دن کون حکم نازل ہوا۔ جس کے بعد یہ آیت نازل ہوئی تو کامل دین، مقبول اسلام اور نعمتوں کا راستہ مل جائے جس کی آخری منزل جنت ہے۔

کتب شیعہ وسنی دونوں نے لکھا ہے کہ:

''غدیر خم میں جب حضورؐ نے حضرت علیؑ کے لیے فرمایا جس کا میں مولیٰ ہوں علیؑ بھی اس کے مولیٰ ہیں تو یہ آیت اتری ''الْيَوْمَ أَكْمَلْتُ لَكُمْ دِينَكُمْ وَأَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِي وَرَضِيتُ لَكُمُ الْإِسْلَامَ دِينًا''

حضرات اہل سنت والجماعت کے معتبر موثق، عظیم ترین اور قدیم مورخ یعقوبی کی تاریخ ابن واضح ج ۲، ص ۳۲ ذیل ما نزل من القرآن بالمدینۃ ملاحظہ ہو۔

پس ثابت ہوا کہ جو مسلمان حضرت علی علیہ السلام کو خلیفہ بلافصل (جس کا علان غدیر میں پیغمبر نے فرمایا تھا) کو مانے گا اس مسلمان کا دین کامل، اسلام مقبول ہوگا اور اس پر نعمتوں کی بارش ہوگی۔

(۷) حکومت علیؑ کا حق ہے!

واقعہ غدیر کے متعلق لکھا جا چکا کہ آیہ بلغ کے نزول پر حضرت نے جناب امیرؑ کے لیے ''من کنت مولاہ فعلی مولاہ'' فرمایا اور اس فرمان کے بعد آیہ اکملت اتری۔ لہٰذا ضرورت ہے کہ ذہن ''من کنت مولاہ فعلی مولاہ'' کے معنی کے بارے میں صاف رہیں کیونکہ لفظ مولیٰ کے بہت سے معنی ہیں اور ہر معنی کا مراد لیا جانا ممکن ہے شیعہ کہتے ہیں کہ جس طرح نبی روحانی پیشوا ہونے کے علاوہ دنیا میں بھی مسلمانوں کے حاکم اور سربراہ تھے اس طرح آپ کے بعد علیؑ مسلمانوں کے روحانی پیشوا اور حاکم ہیں اور پیغام غدیر میں حضورؐ نے حضرت علیؑ کے اسی حق حکومت کا اعلان فرمایا تھا۔ اگر شیعوں کی یہ بات سچی ہو تو خلافت ابوبکر وعمر باطل ہے اور ان خلافتوں کا ماننے والا سنی مذہب بھی باطل ہے۔ لہٰذا

ضرورت ہے کہ لفظ مولیٰ کے معنی معلوم ہوں۔ تمام کتابیں متفق ہیں کہ حضور نے غدیر میں مولیٰ کے استعمال سے پہلے مسلمانوں سے پوچھا تھا کہ:

''مومنین کی جان اور زندگیوں پر مومنین کا حق ہے یا میرا؟ اور مسلمانوں نے بلا اختلاف کہا تھا۔ ہماری جان پر آپ کا حق ہے نہ کہ ہمارا۔ اس سوال اور اقرار کے بعد آپ نے فرمایا تھا جس کا میں مولیٰ ہوں علیؑ بھی اس کے مولیٰ ہیں۔''

(مسند احمد بن حنبل ج ۴، ص ۲۸۱، صواعق محرقہ ابن حجر مکی ص ۲۵، باب ۱، مطبوعہ میمینہ مصر)

معلوم ہوا آنحضرتؐ نے مولیٰ کے لفظ کے معنی پہلے بتلائے اور لفظ مولیٰ اس کے بعد استعمال کیا۔ یعنی جسے مومنین کی جان پر مومنین سے زیادہ حق ہو وہ مولیٰ ہوتا ہے اور اسی معنی سے نبیؐ اور علیؑ مولیٰ ہیں۔ جان اور زندگی پر زندگی والے سے زیادہ کون حق رکھتا ہے اسے اس قانون کی روشنی میں معلوم کیجئے جسے ہمیشہ سے تمام اقوام عالم کی حکومتوں نے تسلیم کیا ہے اور جسے ہر مذہب کے ضابطہ اخلاق کی تائید حاصل ہے۔ یعنی خودکشی کرنے کی اجازت نہ کسی مذہب نے دی ہے نہ کسی قانون نے نہ کسی ضابطہ اخلاق نے۔ بلکہ خودکشی کرنے والے کو اقوام عالم مجرم قرار دیتی ہیں اور حکومتیں خودکشی کرنے والے کو سزا دیتی ہیں۔ اگر زندگی اس کی ملکیت ہوتی جس کی زندگی ہے تو اسے اپنی زندگی دینے کا حق ہوتا جس طرح ہم اپنی ہر ملکیت کے بارے میں خود مختار ہیں۔ اس کے برخلاف حکومت کا خودکشی کرنے میں مداخلت کرنا اور سزا دینا بتاتا ہے کہ زندگی، ہماری ملکیت نہیں بلکہ حکومت کی ملکیت ہے اور خودکشی کرنے والا قومی اور سرکاری ملکیت کو تباہ کرنے والا قرار پاتا ہے لہٰذا مستوجب سزا ہے۔ جب یہ ثابت ہوگیا کہ جان اور زندگی

کی مالک صرف حکومت ہوتی ہے تو رسولؐ کے سوال کا مطلب یہی تھا کہ تم مجھے مومنین کا حاکم مانتے ہو یا نہیں۔ مسلمانوں نے اقرار کیا آپ ہمارے حاکم ہیں اقرار کے بعد رسولؐ کے ارشاد کا مطلب واضح ہے کہ:

''جس طرح میں مومنین کا حاکم ہوں اسی طرح علیؑ بھی مومنین کے حاکم ہیں۔''

لہٰذا مومنین کی جماعت میں صرف وہی شامل ہوگا جو نبیؐ کو اور نبیؐ کے بعد علیؑ کو حاکم تسلیم کرے گا اب اگر کوئی دوسرا حاکم بنتا ہے یا ہم اس کی حکومت کی حمایت کرتے ہیں اور تسلیم کرتے ہیں تو ہم سب ناحق اور باطل پر ہیں۔ حق پر صرف وہی ہے جو علیؑ کے بعد نبیؐ بلافصل حاکم تسلیم کرتا ہے۔

(۸) واضح حق

اگر غدیر میں لفظ مولیٰ کے معنی حاکم کے علاوہ کچھ اور ہوتے تو حضرت علیؑ کو کوئی منصب یا عہدہ نہ ملا ہوتا اور اگر منصب اور عہدہ نہ ملتا تو حضرت عمر حضورؐ کے اعلان من کنت مولاہ فعلی مولاہ کے بعد خصوصی مبارکباد نہ دیتے اور تمام اصحاب حتیٰ کہ ازواج پیغمبر آپ کو مبارکباد نہ دیتیں۔ حالانکہ حضورؐ کے اعلان کے بعد:

''حضرت عمر نے حضرت علیؑ کو مبارکباد دی کہ آج تم ہر مومن ومومنہ کے مولیٰ (حاکم) ہوگئے اور یہی مبارکباد اصحاب اور ازواج نے بھی دی۔''

(ملاحظہ ہو مسند احمد ابن حنبل ج ۴، ص ۲۸۱)

(۹) مخالفتِ علیؑ کی حد!

واقعہ غدیر سچا تھا حضرت علیؑ کا حق حکومت واقعہ تھا۔مگر سچی بات کے جھٹلانے والے اور وفات پیغمبر کے بعد سقیفہ بنی ساعدہ سے حکومت وخلافت شروع کرنے والوں کے مخالف طرز عمل کو واقعہ غدیر کو غلط ثابت کرنے کے لیے پیش کیا جاتا ہے۔ کہ اگر حضورؐ نے علیؑ کی خلافت بتائی ہوتی تو مسلمان کیوں نہ مانتے اور مسلمانوں نے نہیں مانا لہٰذا حضورؐ نے خلافتِ علیؑ کا حکم ہی نہیں دیا تھا۔صرف ایک فریب ہے جس میں مسلمانوں کے ذہنوں کو مبتلا کر کے ان کو حق سے ہٹایا جا رہا ہے۔ ہونا یہ چاہئے تھا کہ جن لوگوں نے حضورؐ کے حکم خلافت علیؑ کو نہیں مانا ان کو نہ مانا جاتا اور کہا جاتا کہ انہوں نے حکم رسولؐ نہیں مانا لہٰذا یہ لوگ اس قابل نہیں ہیں کہ ان کو مانا جائے لیکن اس کے برخلاف صورت حال یہ ہے کہ ان مخالفین حکم رسولؐ کو بہرصورت مان لیا گیا ہے لہٰذا کہا جاتا ہے کہ انہوں نے خلافت علیؑ کو نہیں مانا کیونکہ رسولؐ نے حکم ہی نہیں دیا تھا۔اور اس جھوٹ کو سچ کے مقابلہ میں پیش کرنے کے لیے کہا جاتا ہے کہ ”کیسے ممکن ہے کہ رسولؐ حکم دیں اور مسلمان خصوصاً اصحاب کبار حکم رسولؐ نہ مانیں“ لیکن آیہ بلغ جس کے نازل ہونے پر حضورؐ نے خلافت علیؑ کا حکم مسلمانوں کے سامنے پیش کیا تھا۔اس آیت کا ایک فقرہ آج بھی اس بات کا گواہ اور ضامن ہے کہ مسلمان اور اصحاب کبار حضورؐ کے غدیری حکم کو ماننے والے نہ تھے۔ کیونکہ آیت کا آخری فقرہ ہے۔ واللہ یعصمک من الناس۔ (رسول حکم خلافت علیؑ) پہنچا دو دشمنوں سے ہم تمہاری حفاظت کریں گے۔ یہ حکم صرف مسلمانوں کے سامنے پیش ہوا تھا اور مسلمانوں سے متعلق تھا مگر اس حکم کے پہنچانے میں رسولؐ کو اپنی جان کا خطرہ تھا اور

اتنا سخت خطرہ کہ خدا وعدہ حفاظت کر رہا تھا۔معلوم ہوا اگر مسلمان یہ حکم ماننے والے ہوتے تو حکم پہنچانے والے رسولؐ کے لیے حکم پہنچانے میں خطرہ نہ ہوتا۔خطرہ نہ ہوتا تو خدا حفاظت کا انتظام نہ کرتا۔ بلکہ خطرہ تھا اور صرف مسلمانوں سے خطرہ تھا کیونکہ خلافت علیؑ کے مخالف، غیر کیوں ہوتے انہیں اس مسئلہ سے کیا سروکار تھا۔البتہ بعد نبیؐ حکومت کرنے کے خواہشمند مسلمان خلافت علیؑ کے مخالف تھے نہ صرف مخالف بلکہ دشمن۔ نہ صرف علیؑ اور ان کے حق خلافت کے دشمن بلکہ اگر رسولؐ حکم خلافتِ علیؑ بحکم خدا بھی پہنچائیں تو یہ مخالف اور دشمن، نبیؐ کی جان کے دشمن ہو جائیں اور اگر خدا حفاظت نہ کرے تو حضور کو قتل کر دیں۔

ان حالات کا تقاضا یہی تھا کہ بعد نبیؐ، علیؑ کو ان کا حق حکومت وخلافت نہ ملے اور نہیں ملا۔لوگ کہتے ہیں کیسے ممکن ہے کہ رسولؐ کہیں اور مسلمان وصحابہ کبار نہ مانیں۔ میں پوچھتا ہوں یہ کیسے ممکن ہے مسلمان اور صحابہ کبار، رسول کے دشمن ہو جائیں۔مگر یہ ممکن نہیں بلکہ واقعہ تھا جس کا گواہ قرآن ہے تو حضورؐ کے بعد جناب امیرؑ کو خلافت نہ ملی تو حالات ہی کہہ رہے تھے کہ نہ ملے گی البتہ اگر مل جاتی تو حیرت ہوتی۔اگر مل جاتی تو لوگ سوچ سکتے تھے کہ رسولؐ کے اثرات نے علیؑ کو خلافت دلوائی مگر ۲۵ رسالہ تین خلافتوں کے باوجود ۳۵ ہجری میں علیؑ کو خلافت ملی تو صرف یہ علیؑ کے اثرات تھے۔خلافت ملی تھی یا تاریخ کا ”عظیم معجزہ“ ہو رہا تھا۔حق واضح ہے جس کا جی چاہے مانے جس کا جی چاہے اپنی آنکھ کے ساتھ عقل وہوش ودیانت کو بھی بند کر لے۔

(۱۰) فیصلہ کیجئے

کہا جاتا ہے کہ اگر حضرت علیؑ کی خلافت بلافصل مان لی جائے تو بڑے بڑے صحابہ بلکہ وفات پیغمبرؐ کے بعد سے اب تک کے مسلمانوں کی بڑی تعداد کو گمراہ اور دوزخی ماننا پڑے گا اور جنتی صرف شیعہ قرار پائیں گے جن کی تعداد آج بھی بہت کم ہے اور ماضی میں تو بہت ہی کم تھی لہٰذا یا اکثریت کو دوزخی مانا جائے اور علیؑ کو خلیفہ بلافصل مانا جائے۔ یا خلافت بلافصل علیؑ سے انکار کیا جائے اور اسلام کی اکثریت اور بڑے بڑے مسلمانوں اور صحابہ کبار کو جنتی مانا جائے لہٰذا اسلام کی اکثریت اور صحابہ کبار کی حمایت کا تقاضا یہی ہے کہ ''خلافت بلافصل'' کے عقیدے سے انکار کیا جائے۔ مسئلہ اگر سیاسی ہوتا تو مذکورہ بالا حساب کی بڑی قیمت تھی لیکن مسئلہ دینی ہے۔ لہٰذا مصالح ومفاد افراد کے بجائے حقیقت کا سامنا کر کے حق کی پیروی کرنا ضروری ہے۔ مذکورہ بالا مخالفین ''خلافت بلا فصل علیؑ'' کا کہنا ہے کہ اس عقیدہ کو ماننا مسلمانوں کی بڑی تعداد اور عظیم اکثریت کو دوزخی ماننا اور صرف ایک فرقہ شیعہ کو جنتی ماننا ہے۔ ہم کو تسلیم ہے کہ صورت حال یہی ہے مگر تمناؤں سے صورت حال نہ بدلتی ہے نہ بدلی جاسکتی ہے۔ آیئے نبیؐ سے معلوم کرلیں کہ مسلمانوں کی اقلیت واکثریت میں کون دوزخ میں جائے گا اور کون جنت میں؟ تو حضورؐ فرمائیں گے میں نے تو اقلیت واکثریت کے طبقات تقسیم سے قبل خبر دی تھی جس کا حوالہ نقل کیا جاچکا ہے کہ:

''میرے بعد مسلمانوں میں ۷۳ فرقہ ہوں گے جن کی عظیم اکثریت ۷۲ فرقے دوزخ میں جائیں گے اور معمولی اقلیت صرف ایک فرقہ جنت میں جائے گا۔''

کیا مسلمان تیار ہیں کہ ارشاد پیغمبر کی روشنی اور تاریخ کے آئینہ میں فیصلہ کریں کہ:

''اکثریت میں کون تھا اور ہے اور اقلیت میں کون اور قیامت کے دن اقلیت کہاں ہوگی اور اکثریت کہاں؟''

ع: ہائے افسوس زود پشیماں کا پشیماں ہونا

(۱۱) نبی کو مانئے یا خلفاء کو!

حضورؐ کی وفات کے بعد سقیفہ بنی ساعدہ میں ابوبکر خلیفہ بنے انہوں نے اپنے بعد عمر کو بنایا اور آپ کی مقرر کردہ مجلس شوریٰ نے علیؑ کی مخالفت کر کے عثمان کو خلیفہ بنایا۔ ان کے بعد عہد معاویہ سے ''ترکی خلافت'' تک صرف دنیاوی حکومت تھی خلافت ان سے پہلے ختم ہوگئی تھی یہ ہے مسئلہ خلافت کا وہ خلاصہ جس پر سنی مذہب کی بنیاد ہے۔

اور اس خلافت کی بنیاد ہے کہ ''حضورؐ نے اپنی زندگی میں کوئی خلیفہ مقرر نہیں کیا تھا بلکہ مسئلہ خلافت امت کے طے کرنے کے لیے چھوڑا تھا۔'' مگر حضورؐ نے اپنی تبلیغ کے آغاز کے دن اپنی پہلی تقریر میں دعوت ذوالعشیرہ میں خلافت علیؑ کے حوالہ کردی تھی۔ تفصیل درج ذیل ہے۔

تین سالہ مخفی تبلیغ کے بعد:

''جب حضور کو حکم ہوا کہ کھلی تبلیغ کریں اور سب سے پہلے اپنے قرابتداروں میں اظہار تبلیغ کریں تو حضرت کے حکم سے حضرت علیؑ نے بنی عبدالمطلب کو مدعو کیا جو

چالیس آدمی تھے۔ پہلے دن ابولہب نے تقریر پیغمبر سے مجمع کو یہ کہہ کر بھڑکایا اور اٹھایا کہ محمدؐ جادو کر رہے ہیں کیونکہ کھانا کم تھا۔ حضرتؐ نے پہلے اسے چکھ کر کہا بسم اللہ کھاؤ اور کھانا اتنا رہا کہ سب لوگوں نے سیر ہو کر کھایا۔ دوسرے دن حضورؐ کے حکم سے حضرت علیؑ نے پھر سامان ضیافت کیا اور سب لوگ جمع ہوئے۔ حضورؐ نے تقریر فرمائی کہ اے لوگو! میں خیر دنیا وآخرت (اسلام) تمہارے پاس اپنے خدا کے حکم سے لایا ہوں۔ تم میں سے کون ہے جو اس کام میں میرا شریک ہو کر میرا بھائی وصی اور تم میں میرا خلیفہ ہو۔ باوجود کمسنی کے حضرت علیؑ نے مدد کا وعدہ کیا۔ حضورؐ نے جناب امیر کی گردن پر ہاتھ رکھ کر فرمایا: ''یہ میرا بھائی، وصی اور تم میں میرا خلیفہ ہے اس کی اطاعت تم پر فرض ہے۔ مجمع مذاق اڑاتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا اور جناب ابوطالب سے کہا یہ تم کو بیٹے کی اطاعت کا حکم دیتے ہیں۔''

کنز العمال ج/۶، کتاب الفضائل، باب فضائل علی علیہ السلام ص/۳۹۷، مطبوعہ دائرۃ المعارف النظامیہ حیدرآباد ۱۳۱۴ھ۔

ابوالفداء ج/۱، ص/۱۱۶۔۱۱۷، مطبوعہ الحسینیہ مصر۔

تاریخ کامل ج/۲، ص/۲۲۔

تاریخ طبری ج/۲، ص/۲۱۷، مطبع حسینیہ مصر۔

مذکورہ بالا واقعہ کے بعد اگر خلفا برحق تھے تو رسولؐ نے وقت وفات انتخاب خلیفہ کا حق امت کو دیا تھا مگر آپ حق انتخاب امت کو تب دے سکتے تھے جب علیؑ کے حق کی خلاف ورزی کرتے کیونکہ نصرت نبوت کے وعدہ پر علیؑ کو ذوالعشیرہ میں خلیفہ بنا چکے تھے اور علیؑ حق نصرت ادا کر چکے تھے۔ لہٰذا بات اس منزل پر آجاتی ہے کہ خلفا برحق ہوں تو حضور کام نکل جانے کے بعد علیؑ کو ان کا حق دینے اور اپنا وعدہ پورا کرنے کے بجائے

حق تلفی فرمائیں یا حضورؐ کا دامن حق تلفی اور وعدہ کی خلاف ورزی کے عیب سے پاک مانا جائے جیسا کہ ہر عیب سے پاک ہے تو خلفاء ناحق، غاصب، باطل قرار پاتے ہیں لہٰذا مسلمان کو فیصلہ کرنا ہے کہ وہ نبیؐ کو پاک کردار کا مانے یا خلفاء کو حق مانے ہم کو تو اسلام حضورؐ کے قدموں سے ملا ہے۔ کسی دوسرے کی ہمیں کیا فکر۔

(۱۲) سچا فرقہ!

گذشتہ ۱۱ دلیلوں سے یہ واضح ہو چکا ہے کہ شیعہ وسنی میں صرف فرقہ شیعہ سچا ہے اب بحث صرف اتنی باقی رہ جاتی ہے کہ حضرت علیؑ کے بعد کون، کون امام وخلیفہ برحق ہیں۔ اس تفصیل میں کئی فرقے پائے جاتے ہیں۔ زیدی، بوہرہ، آغاخانی اور اثنا عشری وغیرہ۔ ان میں بھی صرف ایک ہی فرقہ سچا اور حق پر ہو سکتا ہے۔ وہ کون فرقہ ہے اسکے معلوم کرنے کا راستہ بہت واضح ہے۔ جب یہ طے ہو چکا کہ حضرت علیؑ کو حضورؐ نے بحکم خدا خلیفہ بلافصل قرار دیا تھا تو آپ کے بعد صرف وہی لوگ خلیفہ برحق اور امام امت ہوں گے جن کو رسول بتائیں گے۔ حکومت پانے سے نہ خلفاء برحق ہو سکے نہ فاطمی بادشاہ یا اور کوئی حکومت قائم کر کے خلیفہ برحق وامام وہادی ہو سکتے ہیں اصول ایک رہے گا۔ بدل جائے تو اصول نہیں اس اصول پر صرف شیعہ اثنا عشری ہی سچا فرقہ ہے کیونکہ ہم بارہ اماموں کو مانتے ہیں جن کی تعداد رسولؐ نے مقرر کی تھی لہٰذا جتنے فرقوں کے امام ۱۲ سے کم یا زیادہ ہیں وہ باطل ہیں۔ نیز جن بارہ اماموں کو ہم مانتے ہیں انکے نام، ولدیت، القاب اور ان کی ترتیب حضورؐ نے بیان فرمائی تھی۔ جو آج بھی کتب اہل سنت میں موجود ہیں لہٰذا جو فرقہ اپنے مخالف کی کتاب سے اپنے ائمہ کے نام، ولدیت، القاب اور ان کی ترتیب

فرمان پیغمبر کے ذریعہ بتلا سکے وہ برحق ہے اور جو ایسا نہ کر سکے اسے اپنے باطل ہونے کا اعتراف محشر سے قبل کر لینا چاہئے۔

ہماری سچائی کی آخری دلیل ملاحظہ ہو:

''حضور نے فرمایا کہ اسلام ختم نہ ہوگا جب تک کہ بارہ خلیفہ نہ ہولیں جو سب قریشی ہوں گے۔''

صحیح مسلم کتاب الامارۃ ج ۲/ص ۱۹۴-۱۹۵، مطبع کلکتہ۔

صحیح بخاری کتاب الاحکام ج ۴/ص ۱۴۴، مطبع میمینہ مصر۔

سنن الترمذی کتاب الفتن ج ۲/ص ۱۱۵، باب ۴۶/ ، مطبع نول کشور لکھنؤ۔

مسند احمد ابن حنبل ج ۵/ص ۱۰۶۔

لہٰذا بارہ سے کم یا زیادہ ائمہ و خلیفہ ماننے والے کسی طرح حق پر نہیں ہو سکتے۔ یہ بارہ ائمہ کون ہیں زبان پیغمبر سے ان کے نام مع ولدیت و لقب بترتیب سنئے۔

علیؑ ان کے بعد حسنؑ ان کے بعد حسینؑ پھر علی ابن الحسینؑ زین العابدینؑ، پھر محمد بن علی الباقرؑ، پھر جعفر بن محمد الصادقؑ، پھر موسیٰ بن جعفر الکاظمؑ، پھر علیؑ ابن موسیٰ الرضاؑ، پھر محمد بن علی الجوادؑ، پھر علی بن محمد الہادیؑ، پھر حسن بن علی العسکریؑ، پھر محمد بن حسن المہدیؑ۔

ینابیع المودۃ باب ۷۶/ص ۳۶۹/، مطبوعہ ۱۳۱۱ ہجری بمبئی۔

مودۃ القربیٰ از سید علی ہمدانی آخری مودۃ۔

ان بارہ اماموں کے حالات کتب اہل سنت صواعق محرقہ ابن حجر مکی، روضۃ الاحباب وغیرہ میں پڑھیے اور دیکھئے کہ حضورؐ کے بعد ایسے پاکیزہ افراد کس فرقہ کی تاریخ

میں پائے جاتے ہیں؟

سچے اسلام اور صحیح مذہب کی جستجو اور تحقیق کرنے والوں کے لیے مذکورہ بالا تحریر کافی ذخیرہ ہے مگر اس سے قبل دل و دماغ کو ہر طرح غیر جانبدار بنانے کی ضرورت ہے۔ علامہ احمد امین انطاکی اور ان کے بھائی صرف حدیث ثقلین و حدیث سفینہ پڑھ کر شیعہ ہو گئے تھے۔

مقدمہ میں صرف اہل سنت کا حوالہ دیا ہے تا کہ کسی قسم کا شبہ نہ رہ جائے۔

اصل کتاب کے ترجمہ میں لفظی ترجمہ کی پابندی بالکل نہیں کی گئی ہے بلکہ ترجمہ معنوی ہے جس میں اردو محاورہ کی طرف زیادہ توجہ کی گئی ہے۔

یہ تحریر اس دعا پر ختم کرتا ہوں کہ میری زندگی مذہب و محبت اہل بیت علیہم السلام پر ختم ہو مذہب شیعہ اثنا عشری زندہ باد۔ آواز جناب محمد ابن ابی بکر پائندہ باد۔